حرف آگہی

ادبی، تنقیدی، تاثراتی اور تبصراتی تحریروں کا مجموعہ

محمد ثناء الہدیٰ قاسمی
نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ

ناشر
الہدیٰ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ حاجی پور، ویشالی

نام کتاب	:	حرف آگہی
مصنف	:	محمد ثناء الہدیٰ قاسمی
سن اشاعت	:	جنوری ۲۰۱۵ء
تعداد اشاعت	:	گیارہ سو
قیمت	:	چار سو روپے
کمپوزیٹر	:	محمد یار علی نعمانی
مطبع	:	

-: ملنے کے پتے :-

۱- مکتبہ امارت شرعیہ، پھلواری شریف، پٹنہ

۲- بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ

۳- نور اردو لائبریری، حسن پور گنگھٹی، بکساما، ویشالی 844122

۴- کتابستان چندوارہ، مظفر پور

۵- الہدیٰ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ روڈ نمبر ۶/آشیانہ کالونی باغ ملی، حاجی پور ویشالی

آئینہ

ابتدائیہ

''حرف آگہی'' میرے تنقیدی، تاثراتی اور تبصراتی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے، پہلا مجموعہ نقد معتبر کے نام سے اہل علم کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، جس کی اچھی پذیرائی ہوئی، کمال اپنا تو کچھ نہیں تھا، قارئین کے زاویہ نظر کا تھا، جس میں داد وتحسین کے پھول نچھاور کیے۔

اس دوسرے مجموعے میں دو باب ہیں، پہلا باب حرف معتبر کے عنوان سے ہے، اس باب میں شروع کے مقالے، اسلامی ادب کے تنقیدی اصول اور اردو میں قصہ نگاری کی روایت- اسلامی ادب کے حوالہ سے'' رابطہ ادب اسلامی کے سمینار کے لیے لکھا گیا تھا، جو سمینار میں پڑھا گیا اور مقبول ہوا، تیسرا مقالہ عربی شاعری کے تنقیدی رجحانات'' پٹنہ یونیورسیٹی میں عربی ریفریشر کورس کے لیے لکھا گیا اور اس کی روشنی میں طویل محاضرہ عربی زبان وادب کے پروفیسر صاحبان کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، اس باب کے دوسرے مضامین کی حیثیت تبصرے کی ہے، جو مختلف اخبارات ورسائل میں چھپتے رہے ہیں۔

اس کتاب کا دوسرا باب ''حرف چند'' ہے، اسی عنوان سے مختلف حضرات کی خواہش پر نئی کتابوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا اور وہ متعلقہ کتابوں میں شامل ہوتے رہے، اس سلسلہ کا آغاز تیس سال قبل مرتضی کلیم مظہری کی کتاب ''آداب زندگی'' سے ہوا تھا، اتفاق سے وہ کتاب دستیاب نہیں ہوسکی اور وہ تحریر اس مجموعہ میں شامل نہیں کی جاسکی، اب تک کی آخری تحریر مفتی نیر اسلام کی کتاب ''حجاب کے فوائد اور بے حجابی کے نقصانات'' پر ہے، جو اس کتاب میں شامل ہے۔

جن کتابوں پر ''حرف چند'' لکھا گیا، ان میں سے کئی ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوسکیں، مثال کے طور پر صفی اختر صاحب کی کتاب ''آگہی''، مفتی فیاض احمد کی کتاب اردو املا نویسی، مولانا صدر عالم ندوی کی کتاب مولانا ابوالکلام قاسمی شخصیت اور خدمات کا نام لیا جاسکتا ہے، لیکن یہ مکمل

فہرست نہیں ہے، اور بھی کئی کتابیں ایسی نکل سکتی ہیں۔

میرے مضامین کو کمپوزنگ کے بعد محفوظ رکھنے کا کام مولانا راشد العزیزی ندوی، جناب عتیق الرحمٰن اور مولانا عادل فریدی کرتے رہے ہیں، جس کی وجہ سے جمع وترتیب میں بڑی آسانی پیدا ہوئی، جو مضامین محفوظ نہیں رہ سکے تھے، اس کی کمپوزنگ مولانا محمد یار علی نے کیا ہے اور پیشہ وارانہ نہیں محبت کے جذبہ سے کیا ہے، میں ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں، اللہ سب کو بہتر بدلہ عنایت فرمائے۔ آمین

تصنیف وتالیف کے کام کے لیے خانگی مشغولیت بڑی رکاوٹ ہوتی ہے، اللہ کا شکر ہے کہ میری اہلیہ، پسران اور برادران نے اس مشغولیت سے مجھے ہمیشہ الگ رکھا، والد صاحب ماسٹر محمد نور الہدی صاحب (اللہ ان کو صحت وعافیت کے ساتھ درازی عمر عطا فرمائے) کی شب وروز دعاؤں کے لیے اٹھے ہاتھ بھی ہمارے کاموں میں تسلسل اور برکت کا بڑا سبب ہیں، میں ان تمام کے لیے شکر کے الفاظ کو کافی نہیں سمجھتا۔

اللہ کرے میری دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی آپ کو پسند آئے، آپ جو میرے ناقد بھی ہیں اور قاری بھی۔

محمد ثناء الہدی قاسمی

۲۵/۱۰/۲۰۱۴ء

۲۹/۱۲/۱۴۳۵ھ

باب اول

حرف معتبر

اسلامی ادب کے تنقیدی اصول

عام طور سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ تنقید سب سے آسان کام ہے۔ اس کے لیے کوئی متعین اصول نہیں ہے؛ اور پڑھنے والے کے عقل ودماغ پر ادب پارے نے جو اثرات چھوڑے یا اثر آفرینی میں جو کمی رہ گئی اور جس وجہ سے رہ گئی اس کا ذکر تنقید کہلاتا ہے، اور چونکہ قاری ہر قسم کے ہوتے ہیں، وہ فن پاروں کی توضیح وتشریح اپنے اپنے انداز میں کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ایک تخلیق کسی کے نزدیک قابل قدر ہوتی ہے اور کسی کے نزدیک اس کا مقام ومرتبہ انتہائی گر جاتا ہے۔ یہ ادبی تنقید نہیں ہے؛ بلکہ اپنے ذہن ودماغ کا سانچہ ہے، یہ اپنا اپنا ذوق ہے۔ جو قدر وقیمت کی تعیین کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی تخلیقات ''جو ادب برائے ادب'' کے نقطۂ نظر سے لکھی گئیں، ترقی پسندوں کو نہیں بھاتیں۔ ادب برائے زندگی کے قائلین اسے پسند نہیں کرتے۔

اسلامی ادب کے ترجمان ادب کو صرف زندگی نہیں مابعد الموت کی حیات سے بھی جوڑتے ہیں۔ اس لیے ان کی پرکھ اور پسندیدگی کا پیمانہ کچھ اور ہے۔ تحریک ادب اسلامی کے بانی سید عروج قادری نے ''اسلامی ادب'' کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اسلامی ادب ایک ایسا سدا بہار گلشن ہے، جو توحید کی زمین پر اگتا، وحی الٰہی کی پاکیزہ بارش سے سیراب ہوتا ہے اور آخرت کی لازوال خوشبو سے مہکتا ہے''۔

ممکن ہے کہ اسلوب اور ہیئت کے اعتبار سے دونوں میں بڑا فرق سمجھ میں نہیں آتا ہو؛ لیکن جب ہم مواد، مقصدیت اور خود شاعر وادیب کے مزاج ومنہج کا مطالعہ کریں گے۔ اس کی ذات، اس کے مشاہدات، اس کی داخلی کیفیات، اس کے تجربات اور شعور کے عرفان کو سامنے رکھیں گے تو دونوں کے انداز واسلوب، کہنے کے طریقے، ہیئت کے تجربے میں واضح اور نمایاں فرق محسوس ہوگا۔ اسی فرق نے ادب میں تنقیدی روایات کو جنم دیا۔ اور حالی سے لے کر کلیم الدین احمد اور اس کے بعد تک کہنا چاہیے کہ اردو تنقید تجربات کی ایک داستان ہے۔ اور تجربات کا یہ کارواں آج بھی آگے بڑھتا جا رہا ہے۔ اور انہیں

تجربات کے درمیان اسلامی ادب نے اپنے وجود کو تسلیم کروایا ہے، جو لوگ مقصدی شاعری پر بخاری شریف نظم کرنے کی پھبتیاں کسا کرتے تھے، آج اس کو تسلیم کرنے لگے ہیں۔ اور اصلاحی افسانے جن کو ملا کی وعظ نظر آتے تھے، اب فن پارے نظر آنے لگے ہیں، یہ ایک اچھی بات ہے؛ لیکن ادب کا تنقیدی رویہ اسلامی ادب کے ساتھ آج بھی پہلے جیسا ہی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ تنقیدیں اصول سے عاری اور خود ساختہ طریقوں سے گھری ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے یہ بہت زیادتی کی بات ہوگی کہ ہم رومانی شاعری سے ترقی پسند شاعری اور جدید شاعری کا موازنہ مابعد جدیدیت سے کرنے لگیں۔ ممکن ہے ان میں نکتۂ اشتراک نکل آئے؛ لیکن ہمیں اس بات کو اچھی طرح جاننا چاہیے کہ ہر ادیب وشاعر اپنے دور کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ اسی فضا میں جیتا اور سانس لیتا ہے؛ جو فضا اسے حال میں میسر ہے اور ماضی سے جو اسے ورثہ میں ملا ہے۔ وہ حال کا پیامبر ہوتا ہے؛ مستقبل کا نہیں؛ اسی اصول سے اسلامی ادب کا افشا کیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ تینوں زمانوں کو محیط ہے؛ بلکہ اس کے دائرے میں مبدا ومعاد بھی سماتے ہیں۔ اس لیے اسلامی ادب پر تنقید کرتے ہوئے ہمیں اس بات کو ملحوظ رکھنا ہوگا، ہم مسدس حالی کو یہ کہہ کر آگے نہیں بڑھ سکتے کہ یہ قوم کا مرثیہ ہے۔ ہمیں اس کے اسباب وعلل کا حالی کے زمانہ میں جا کر تجزیہ کرنا ہوگا۔ شاہنامہ اسلام کو ہم سیر وتواریخ اسلامی کہہ کر گزر نہیں سکتے؛ بلکہ اس نے جس طرح پورے ایک دور کو متاثر کیا اور جس طرح ہمارے حال کو ماضی سے جوڑا، اس کی تعیین بھی ضروری ہوگی۔

تنقید پرکھ کا نام ہے۔ لیکن یہ پرکھ تخلیق کی تشریح، حکم اور تعیین مراتب کے ساتھ ہونی چاہیے، تنقید نگار کو مصنف کے ذاتی حالات کا بھی علم ہونا چاہیے اور شاعر کی شخصیت کا بھی۔ اور یہ علم تخلیق کی تنقید کے وقت کاغذ پر بھی منتقل ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اسلامی ادب میں مواد، ہیئت اسلوب کے ساتھ ادیب اور فنکار کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اس کے ذاتی اخلاق وکردار کی واقفیت بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اللہ رب العزت نے شاعری کی مذمت نہیں کی ہے، شعراء کی مذمت کی ہے، اور انہیں غاوون کا متبع اور وادیوں میں بھٹکنے والا قرار دیا ہے۔ اور قول وعمل کا تضاد اس کی مذمت کا سبب بنا ہے۔ اس لیے اسلامی ادب کی تنقید میں ادیب، شاعر، افسانہ نگار اور تخلیق کار کی زندگی کا بھی مطالعہ کیا جائے گا اور یہ دیکھا جائے گا کہ اس کے قول وعمل میں کتنی مطابقت اور ہم آہنگی ہے، ایک تخلیق کار اسلامی معتقدات اور افکار کو شعر وادب

میں ڈھال رہا ہے؛ لیکن اس کا اپنا عقیدہ اور عمل اس کے خلاف ہے۔ تو وہ مواد و ہیئت کے اعتبار سے ادب پارہ ہوسکتا ہے؛ لیکن ہم اسے اسلامی ادب کے خانے میں نہیں رکھ سکتے؛ کیونکہ جو بات اس نے کہی ہے اس میں وہ جھوٹا ہے اور جو جھوٹ ہو وہ سارے ادبی تقاضوں کو پورا کرنے کے باوجود اسلامی ادب نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم میں اس کی واضح مثال منافقین کے بارے میں ہے؛ ارشاد ربانی ہے: ''إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ أَنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ '' وہ گواہی دیتے ہیں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ جانتا ہے کہ آپ اس کے رسول ہیں؛ لیکن اللہ گواہی دیتے ہیں کہ منافقین جھوٹے ہیں؛ کیونکہ ان کے معتقدات ان کے قول کے مطابق نہیں ہیں۔ قول و عمل کے اس تضاد کو بڑا گناہ قرار دیا گیا اور ارشاد فرمایا گیا۔ ''كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ أَنْ تَقُولُوا مَالَا تَفْعَلُونَ '' یہاں پر اللہ تعالی کے اس قول: ''أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ '' کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے۔

اس اصول کا اثر یقیناً ان تمام اصناف پر پڑے گا جو خالص اسلامی موضوعات کے حامل ہیں؛ لیکن ان کے تخلیق کار قول و عمل کے تضاد کے شکار ہیں؛ ایسی تمام تخلیقات نقادوں کی نظر میں اعلی ادب ہوسکتا ہے؛ لیکن اسلامی ادب اسے نہیں کہا جاسکتا۔

دوسرا مرحلہ تشریح کا ہے جو تخلیق ہے اس کے معنی و مفہوم کیا ہیں؟ نقاد کو یہ بھی واضح کرنا ہوگا کہ استعارہ، کنایہ اور تلمیحات جو استعمال کئے گئے؛ اس کا پس منظر کیا ہے اور وہ کس حد تک تاریخی اور ادبی اعتبار سے صحیح ہیں؛ کیونکہ تاریخ کا صحیح ادراک تنقید نگاری میں بہت معاون ہوتا ہے۔ مے کدہ جام و مینا، عشق و مستی، جذب و کیف کے معنی حقیقی لیے گئے ہیں یا مجازی اور پھر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اس کا ادراک ہمیں ان مقاصد سے دور تو نہیں کر رہا ہے۔ جو انسانی اقدار و اخلاق کا اسلامی ہدف ہے۔ اگر اس مرحلہ میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ تخلیق انسان کو اس کے تخلیقی مقصد سے دور لے جانے کا سبب بن رہی ہے تو ہم اسے اسلامی ادب کے دائرہ میں نہیں رکھ سکتے؛ کیونکہ وہ ہمارے ہدف کو پورا نہیں کرتا ہے۔ اس مرحلہ میں نقاد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ سارا زور معنی کی گرہیں کھولنے میں لگا دے تاکہ تخلیق کی تشریح صحیح طور پر ہوسکے۔

اس مرحلہ پر پہنچ کر نقاد، تخلیق پر حکم لگانے کی پوزیشن میں ہوتا ہے۔ لیکن ہمارا نقاد عموماً حکم لگاتے وقت گروہ بندی کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے گروپ اور اپنی جماعت کی حقانیت اور اپنے ذاتی میلان اور انفرادی ذوق سے اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ وہ منصفانہ رائے قائم نہیں کر پاتا ہے۔ اسلامی ادب کی تنقید میں انصاف بنیادی چیز ہے؛ کوئی ذاتی طور پر پسند آئے تو اسے آسمان پر چڑھا دینا اور ناپسند ہے تو اس کے بخیے ادھیڑنا، اسلامی ادب کے نقاد کو زیب نہیں دیتا۔ اس کا اخلاقی ہی نہیں اسلامی فرض بھی ہے کہ وہ منصفانہ انداز سے محاسن و معائب کا تجزیہ کرے۔ اور اس تجزیے میں اظہار حقیقت کے علاوہ کوئی اور جذبہ اس کے اندر کارفرما نہ ہو۔ اس لیے بہتر نقاد وہ ہوتا ہے؛ جو عام علمی مذاق رکھتا ہو، کسی خاص فن یا موضوع سے اس کی گہری وابستگی اور دلچسپی نہ ہو کیونکہ گہری وابستگی بھی انصاف کے راستے میں رکاوٹ ہوا کرتی ہے۔

یہاں ہمیں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ادب ذریعہ تبلیغ ضرور ہے؛ لیکن ہر قسم کی تحریر جو ہمارے ہدف کو پورا کرے؛ اسلامی ادب تو کیا؟ مطلق ادب کے خانے میں بھی اسے ہم نہیں رکھ سکتے، یہیں سے سوال اسلوب کا پیدا ہوتا ہے۔ تنقید کا یہ اہم پہلو ہے؛ جس کا تجزیہ کرکے ہم کسی عام تحریر سے ادب کو ممتاز کرسکتے ہیں۔

اس لیے جب ہمیں کسی تخلیق کے مقام و مرتبہ کی تعیین کرنی ہوگی تو اسلوب کے حوالہ سے بھی ادیب کی انفرادیت کا جائزہ لینا ہوگا؛ کیونکہ اس کے بغیر ہم اس کا مقام ادب میں متعین نہیں کرسکتے۔ طریقۂ اظہار کی ذاتی انفرادیت ہی کسی مصنف کی تخلیق کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔ غالبؔ اور میرؔ کی شاعری میں فرق اسی وجہ سے سمجھ میں آتا ہے۔ ڈپٹی نظیر اور راشد الخیری کی کہانیاں اسی اسلوب کی وجہ سے ممتاز ہوتی ہیں۔ یہ امتیاز اتنا واضح ہوتا ہے کہ یہ نئے لسانی تجربوں، اسلوبیاتی جدتوں نیز پیرایہ بیان یا طرز اظہار کے لیے نئے سانچے کا کام کرتا ہے، جس سے زبان میں تازگی، تنوع، نیا پن اور انوکھا پن پیدا ہوجاتا ہے۔ البتہ اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اس کے نتیجہ میں بے قاعدگی اور اصول و قواعد کی شکست و ریخت تو نہیں ہوئی ہے۔ آج کل لفظیات کی تشکیل کی ایک وبا ہمارے نئے لکھنے والوں میں آئی ہے اور بے جوڑ اور لغوی اعتبار سے بے معنی الفاظ کی تشکیل کا فیشن سا چل پڑا ہے۔ یہ کام انفرادی

طرز اظہار کے نام پر کیا جا رہا ہے اور مہمل الفاظ کی ایک ڈکشنری تیار ہوتی جا رہی ہے۔ جس کی وجہ سے ترسیل وابلاغ میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ دشواری ایہام کا روپ دھارن کر لیتی ہے اور نثر میں تو کم شاعری میں یہ چیستاں بن جاتا ہے۔ بسا اوقات شاعر بھی اس کے معنی سے نابلد ہوتا ہے۔ اور ساختیات کا حوالہ دے کر اس سے پیچھا چھڑا لیتا ہے، ایسے میں پس ساختیات کی ایک ٹولی سامنے آتی ہے اور اس لفظ کے ایسے ایسے معنی بیان کرتی ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے اور سر پیٹنے کو جی چاہتا ہے، مثلاً خیالاب، لفظاب، چہرانیے وغیرہ مثالیں بہت ساری ہیں، یہ چند مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر ذکر کیا گیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زبان جامد شی ہے اور اس میں نئے تجربے نہیں کرنے چاہیے۔ اور اظہار کے نئے وسیلے تلاشنے نہیں چاہیے۔ ضرور تلاشنے چاہیے، اس سے زبان میں جدت اور ندرت کے نئے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ میرا کہنا صرف یہ ہے کہ اسے زبان وادب کے قواعد کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ جب ہم کسی تخلیق کا اسلوبیاتی مطالعہ یا اسلوبیاتی تنقید کریں گے تو ان امور کا خیال رکھنا ضروری ہوگا۔ اور اسلوب کی موضوعاتی تقسیم کرنی ہوگی۔ مثلاً داستانی اسلوب، طنزیہ ومزاحیہ اسلوب، تمثیلی اسلوب، خطیبانہ اسلوب، سوانحی اسلوب، تحریری اسلوب اور ملفوظاتی اسلوب۔ بعض حضرات کے نزدیک یہ جمالیاتی تاثر کو مجروح کرنے کا ذریعہ ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ کسی بھی تخلیق کا لسانی واسلوبیاتی تجزیہ اس کے حسن کو پامال، اس کی لطافت کو زائل اور اس کے استعجاب کو کم نہیں کرتا، اس سے تخلیق کا حسن کھل کر سامنے آتا ہے۔ اور کھرے کھوٹے کی پرکھ ہوتی ہے۔ البتہ اس پرکھ کو سنجیدہ ہونا چاہیے۔ کسی تخلیق پر جملہ بازی کرنا، فقرہ کسنا، فن کار کی پگڑی اچھالنا اسلامی اصولوں سے انحراف، ادبی بدمذاقی اور غیر سنجیدگی کا مظہر ہے۔

تنقید میں تخیل کی آمیزش کو نقادوں نے جزء اعظم لکھا ہے۔ اس کے سہارے ہم تخلیق کار کے دماغ میں گھس کر اس کی ذہنیت، شخصیت اور تجربات کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں؛ لیکن اسلامی ادب کے نقاد کو خصوصیت سے تخیل پر قابو رکھنا چاہیے، اس لیے کہ اگر تخیل کو بے لگام چھوڑ دیا گیا تو تخلیق پیچھے چلی جائے گی۔ اور تخیل کا سرپٹ دوڑ رہا گھوڑا بات کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گا۔ اور ممکن ہے کہ نکتہ بعد الوقوع کے طور پر یہ ایسی تشریح کر بیٹھے جو خود تخلیق کار کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں تھا۔ یہ انداز کافیہ، سلم

پڑھاتے وقت تو ٹھیک ہے؛ لیکن کسی تخلیق کی تنقید کرتے وقت کسی طرح موزوں نہیں۔ کیونکہ اس سے تخلیق کار کی منشا فوت ہوتی ہے اور یہ انصاف پسندی کے بھی خلاف ہے۔

تنقید نگار کو کسی درجہ میں محقق بھی ہونا چاہیے؛ اس لیے کہ جو خیالات پیش کئے جا رہے ہیں، اس کی تحقیق بھی ضروری ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ تخلیق کار نے اپنی تخلیق کی بنیاد کسی مفروضے پر رکھ دی ہے۔ حالی اسے اصلیت سے تعبیر کرتے ہیں اور ان کے نزدیک اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ بھی مقصود نہیں ہے کہ بیان میں اصلیت سے سرمو تجاوز نہ ہو۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ زیادہ تر اصلیت ہونی ضروری ہے۔ میں اس پر صرف اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ تجاوز اس قدر نہ ہو کہ اس کے سرے مبالغہ کے اس سرے تک پہنچ جائیں، جسے ہم جھوٹ کہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اسلامی ادب کے کے تنقید نگار کو اسلامی ادب، اس کی ماہیت اس کے اغراض ومقاصد کو جانچنے اور پرکھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔ وہ کسی فن کا ماہر نہ ہو تو بھی قوت تمیزی مضبوط ہونی چاہیے۔ اسے تخلیق کار کی شخصیت، اس کے افکار وعادات اور فن کو ان اصولوں کی روشنی میں جانچنا اور پرکھنا چاہیے، جن کا ذکر اختصار کے ساتھ اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ میرے اپنے مطالعہ کی حد تک ان اصولوں کا انطباق حضرت مولانا علی میاںؒ کی نقوش اقبال میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مولانا عامر عثمانی کے کھرے کھوٹے بھی اسلامی تنقیدی اصولوں پر پورے اترتے، اگر وہ جماعت اسلامی کے مخالف لٹریچر پر تنقید کرتے ہوئے غیر جانب دار ہوتے۔ ماہر القادری کے تبصرے میں بھی یہی کمی راہ پا گئی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تنقیدیں اتنی مختصر ہیں کہ انہیں تنقید سے زیادہ رائے کہنا زیادہ مناسب ہے۔

اردو میں قصہ نگاری۔اسلامی ادب کے حوالے سے

انسان بنیادی طور پر قصہ گو واقع ہوا ہے۔زمانۂ قدیم میں دن بھر کی معاشی جدوجہد کے بعد تھکا ہارا انسان جب اپنے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھتا تو دن بھر کے واقعات مزے لے لے کر سناتا اور دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتا۔اس طرح قصہ گو کی نفسیات کو تسکین ملتی اور سامعین بھی جب مجلس سے اٹھتے تو دن بھر کی تکان بھول جاتے۔دھیرے دھیرے قصہ گوئی نے ایک فن کی حیثیت حاصل کر لی، اور شعراء کے اشعار کی طرح قصہ نے بھی جغرافیائی حدوں کو توڑ کر ملکوں ملکوں کا سفر کیا اور سینہ بسینہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی چلی گئی، ہمارے گھروں میں دادی ماں اور نانی ماں کے ذریعہ یہ قصے ہم تک پہنچے، جدید ذرائع ابلاغ نے گو قصہ گوئی اور قصوں کی سماعت کی روایت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔لیکن آج بھی وہ دیہات جہاں صنعتی انقلاب نے اپنے پاؤں نہیں پھیلائے ہیں اور وہ علاقے جو بجلی کی سہولیات سے آج بھی محروم ہیں وہاں برگد کے پیڑ کے نیچے چوپال لگتی ہے اور بچے دادی ماں سے قصہ سنانے کی ضد کیا کرتے ہیں، اس طرح دیکھا جائے تو قصہ گوئی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔علی عباس حسینی نے لکھا ہے:

''قصہ کی ابتداء وہیں سے ہوتی ہے جب ابن آدم مدنیت وعمرانیت کے پہلے زینہ پر ملتا ہے....وہ دس دس بیس بیس کی ٹولیوں میں ایک ساتھ رہتا ہے، وہ پیٹ بھرنے کے لئے اپنے سے کمزور جانوروں کا شکار کرتا ہے اور شام کو الاؤ کے گرد بیٹھ کر ایک دوسرے سے دن کے واقعات ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بیان کرتا ہے، جہاں الفاظ کا سرمایہ کم پڑتا ہے وہ مسرت وغم، فتح وشکست، خوف وتہور کے جذبات کو حرکات سے ظاہر کرتا ہے۔'' (ناول کی تاریخ اور تنقید ص ۳)

زمانۂ قدیم میں قصہ کے موضوعات غیر معمولی واقعات، خونیں حادثات، جنگ کے احوال، دہشت وہیبت، اسرار ورموز، افسوں اور بھوت پریت کے قصے، پریوں کے افسانے، عورت اور عشق نیز جانوروں کے احوال ہوا کرتے تھے، ہندوستان کے قدیم قصوں کو دیکھیں تو ان کے موضوعات بھی یہی کچھ ہیں۔

پھر قصہ گو کے قصے محفوظ ہو جائیں اس کے لئے انہیں ڈائری، روزنامچے وغیرہ میں محفوظ کیا

جانے لگا تاکہ مرورِ زمانہ سے یہ قصے ناپید نہ ہو جائیں اور آنے والی نسل کے لئے تاریخی اور واقعاتی طور پر اسے محفوظ رکھا جا سکے۔اس احساس نے قصہ نگاری کے فن کو رواج بخشا، شروع میں یہ قصے انتہائی سادہ ہوتے تھے، ان میں واقعاتی تسلسل ہوتا تھا، صنعت واستعارہ، فصاحت وبلاغت سے خالی یہ قصے دل سے نکلتے اور دل تک پہنچتے تھے۔

سب سے پہلا قصہ جو اس روئے زمین پر وجود میں آیا وہ اس پہلے انسان کا قصہ ہے جسے قرآن کریم میں مختلف جگہوں پر تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے۔پھر کارِ جہاں دراز ہوتا گیا، ابلیسی طاقتوں نے جب جب سر اٹھایا انبیاء کرام بھیجے گئے اور ان کی حیات مبارکہ کو قرآن میں ذکر کیا گیا۔اس صنف کی پاکیزگی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ کو احسن القصص کہا اور قصہ گوئی کی نسبت اپنی ذات کی طرف کیا۔

ارشاد ربانی ہے ''**نحن نقص علیک احسن القصص بما اوحینا الیک ھٰذا القرآن و ان کنت من قبلہ لمن الغٰفلین**'' (یوسف ۱۲:۳) (ہم اس قرآن کے ذریعہ سے جو ہم نے تمہاری طرف بھیجا ہے ایک نہایت اچھا قصہ (واقعہ) سناتے ہیں اور تم اس سے پہلے بے خبر تھے)، **منھم من قصصنا علیک و رسلاً قد قصصنا علیک من قبل** (النساء ۴:۱۶۴)، **تلک القری نقص علیک من انباء ھا** (الاعراف ۷:۱۰۱)، **کلاً نقص علیک من انباء الرسل** (ھود ۱۱:۱۲۰)، **نحن نقص علیک نبأھم بالحق** (الکھف ۱۸:۱۳)، **کذالک نقص علیک من انباء ماقد سبق** (طٰہٰ ۲۰:۹۹)، **ذالک من انباء القری نقصہ علیک** (الانعام ۶:۱۰۰) جیسی آیات اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہیں، ان قصوں کے موضوعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''قرآن مجید کے قصص و واقعات کا سلسلہ بیش تر گذشتہ امتوں اور ان کی جانب بھیجے ہوئے پیغمبروں سے وابستہ ہے اور جستہ جستہ بعض واقعات بھی اس ضمن میں آگئے ہیں اور یہ تمام تر حق وباطل کے مجادلوں اور اولیاء اللہ اور اولیاء شیطان کے معرکوں کا ایک عبرت آموز اور بصیرت خیز وبے مثل ذخیرہ ہے۔'' (قصص القرآن ص ۸)

یہاں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن کریم میں جو قصے مذکور ہیں وہ صرف عبرت حاصل کرنے کے لئے ہیں، اسی لئے قرآن کریم کے قصص میں واقعاتی اور تاریخی تسلسل ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ جتنے حصے کی ضرورت جہاں سمجھی گئی، ذکر کیا گیا، اعادہ کی ضرورت ہوئی تو مکرر ذکر کیا۔ حضرت مفتی شفیع صاحبؒ لکھتے ہیں:

''اسی لئے ان قصوں کے بیان میں واقعاتی ترتیب کی رعایت نہیں کی گئی، بعض جگہ قصہ کا ابتدائی حصہ بعد میں اور آخری حصہ پہلے ذکر کر دیا گیا، اس خاص اسلوب قرآنی میں یہ مستقل ہدایت ہے کہ دنیا کی تاریخ اور اس کے گذشتہ واقعات کا پڑھنا، یاد رکھنا خود کوئی مقصد نہیں بلکہ انسان کا مقصد ہر قصہ وخبر سے کوئی عبرت ونصیحت حاصل کرنا ہونا چاہئے۔'' (معارف القرآن ج ۵ ص ۱۶)

قرآن کریم میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ نے قصہ کا مقصد عبرت کا حصول قرار دیا، ارشاد فرمایا: **لقد کان فی قصصھم عبرۃً لاولی الالباب** (یوسف ۱۱۱:۱۲) غور وفکر نیز عبرت وموعظت کے بنیادی مقصد کے حصول کے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے قصہ بیان کرنے کا حکم دیا اور فرمایا: **فاقصص القصص لعلھم یتفکرون** (الاعراف ۱۷۶:۷)

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اسلام میں قصہ نگاری کی اہمیت محض اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے ہے، ایسے قصے جن کی وجہ سے انسان کے اندر خود شناسی اور خدا شناسی پیدا ہو سکے، عبرت وموعظت کے لئے مفید ہو اور انسان کو اعلیٰ اخلاقی قدروں سے روشناس کرا سکے، اسلام اس کو پسند کرتا ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ اسی نے اس کی طرح ڈالی ہے۔ مقصد کے حصول کے لئے قصہ میں جس ہیئت کا سہارا لیا جاتا ہے، ان کی حیثیت ثانوی ہے، قصہ سے اگر مقصدیت فوت ہو جائے تو یہ صرف وقت گذاری بلکہ وقت کی بربادی کا ذریعہ رہ جاتا ہے لکھنے والوں کے لئے بھی اور پڑھنے والوں کے لئے بھی۔ منشی پریم چند نے بجا لکھا ہے کہ:

''ادیب کا کام صرف قارئین کا دل بہلانا نہیں ہے، یہ تو بھانڈوں، مداریوں اور مسخروں کا کام ہے، ادیب کا منصب اس سے کہیں اونچا ہے، وہ ہمارا رہنما ہوتا ہے، وہ ہماری انسانیت کو جگاتا ہے، ہم میں نیک خواہشات جاری کرتا ہے، ہماری نظر میں وسعت دیتا ہے، کم سے کم اس کا یہی مقصد ہونا چاہئے۔''

قصہ نگاری کا یہ فن جب اور ترقی پذیر ہوا تو واقعات کی نگارش میں قصہ نگار کے اپنے خیالات ونظریات، سماجی وسیاسی حالات کا ذکر بھی ہونے لگا۔ اور دھیرے دھیرے اسلام کے مطلوبہ مقاصد سے انحراف اور صرف نظر کیا جانے لگا۔ اس طرح قصہ نگاری کا تخلیقی عمل قصہ نگار کے ذہن ومزاج کے ساتھ بدلتا چلا گیا، زمان ومکان کی تبدیلیاں بھی اس پر اثر انداز ہونے لگیں اور قصہ نگاری امکانات وتجربات کے مراحل سے گذرنے لگی، موضوعاتی تنوع کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام رکھے جانے لگے، معاشی وسماجی حالات جس قدر سنجیدہ اور مرکب ہوتے گئے قصہ نگاری کی ہیئت وماہیت میں گہرائی اور گیرائی آتی چلی گئی، لیکن اسے کئی طرح کے تضاد، تصادم اور تذبذب سے دوچار ہونا پڑا، لیکن اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس فن میں قوت نمو بڑھی اور یہ فن ارتقا کے منازل طے کرتا چلا گیا۔ ان سب کے باوجود اس کا قصہ پن باقی رہا، قصہ پن نہ ہو تو تخلیق کو قصہ قرار ہی نہیں دیا جا سکتا۔

تجربے اور ماہیاتی کشمکش سے گذرتی قصہ نگاری نے آگے چل کر داستان کا روپ لے لیا اور انسانی نفسیات کی تسکین اور احساس برتری کو تقویت دینے کے لئے ان میں مافوق الفطرت اور دیومالائی کرداروں کو وجود بخشا گیا اور محیر العقول کارناموں کے ذکر سے قصہ کو بوجھل بنانے کی کوشش کی گئی۔ ایسے قصوں میں داستان امیر حمزہ، طلسم ہوش ربا، فسانۂ عجائب، وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، ان داستانوں میں فرضی قصے، حسن وعشق اور وصل وہجر کے تذکرے اس انداز میں کیے گئے ہیں کہ قاری تمام کرداروں کی حرکات وسکنات کو اسی پس منظر میں دیکھتا ہے، اور قصہ سے بندھا رہتا ہے، اس کی دلچسپی قائم رہتی ہے، واقعہ نگاری میں رنگ آمیزی، اسلوب کی چاشنی، کرداروں کی سنجیدگی اور اس کے ساتھ مبالغہ آمیزی اور مضحکہ خیزی کا عجیب وغریب انداز قاری پر جادوئی اثر کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے بیشتر داستانوں کی عبارت میں آمد نہیں آورد اور برجستگی نہیں تصنع کا بول بالا نظر آتا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے قصہ نگاری کو داستانی دور سے باہر نکالنے کا بڑا کام کیا انہوں نے قصہ نگاری سے معاشرہ کی اصلاح کا کام لیا، خواجہ الطاف حسین حالی کی ''مجالس النساء'' نے اس باب میں شہرت پائی، ۱۸۷۴ء میں ''مجالس النساء'' کی تالیف ہوئی، ڈپٹی نذیر احمد نے مرأۃ العروس، ابن الوقت، توبۃ النصوح لکھ کر قصہ نگاری کو کام کی چیز بنا دیا اور شاید پہلی بار اردو میں کسی

قصہ نگار نے محض حظ نفس کے بجائے قصہ نگاری کو مکارم اخلاق کے حصول اور گناہوں سے ندامت اور شرمندگی کے لئے استعمال کیا، ان کتابوں میں زندگی کی ٹھوس حقیقتیں اچھلتی کودتی اور مچلتی نظر آتی ہیں، اسی وجہ سے ان نقادوں نے جو ادب برائے ادب کے قائل ہیں ان کتابوں پر سخت تنقید کی ہے اور لکھا ہے:

''نذیر احمد کے ابتدائی دو قصوں میں واقعات کے ربط، تسلسل اور ارتقا کا احساس سرے سے ناپید ہے، ان واقعات کی منطق فنکار کی منطق ہونے کے بجائے واعظ، مصلح اور کہیں کہیں مولوی کی منطق ہے۔'' (داستان سے افسانے تک ص ۶۲)

اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ ان قصوں نے پہلی بار یہ احساس دلایا کہ معاشرہ کے مسائل قصے میں ایسے مؤثر اور دلنشیں انداز میں پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں ادب کی چاشنی کے ساتھ معاشرتی زندگی کے مسائل کی مصوری اور ایک خاص قسم کی فکر، اصلاحی، مذہبی اور تبلیغی جذبے کے ساتھ لوگوں تک پہنچائی جائے۔ ان قصوں کو پڑھ کر پہلی بار یہ احساس ہوتا ہے کہ اخلاق حسنہ، سیدھے سادے اور سچے کردار کے ذریعہ بھی قصہ نگاری کی جا سکتی ہے۔

قصہ نگاری کا جو فن ان دونوں کے یہاں ملتا ہے اس میں کمی اور خامیاں چاہے جتنی نکالی جائیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ قصے ہی اردو ناولوں کے لئے اساس اور بنیاد بنے۔ اور چونکہ فن ترقی پذیر ہوتا ہے، اس میں نامیت ہوتی ہے اس لئے یہ قصے ناول بن کر ہمارے سامنے آئے۔ بعد کے دنوں میں صادق سردھنوی، نسیم حجازی وغیرہ نے اپنے ناولوں میں اسلامی تاریخ کو قصہ نگاری میں زیب داستان کے لئے بڑھا چڑھا کر استعمال کیا، اور تاریخی ناول نگاری میں نمایاں اور ممتاز مقام حاصل کیا، سماجی اور معاشرتی مسائل کو اٹھانے میں خدیجہ مستور، صالحہ عابد حسین کی قصہ نگاری نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے، ایم اسلم، قیس رام پوری اور رئیس جعفری کا بھی قصہ نگاری میں اہم مقام رہا ہے۔ راشد الخیری، محمد علی طیب کے قصے بھی ہمارے ادبی سرمایہ میں اضافہ ہیں اور بڑی حد تک ادب اسلامی سے قریب تر ہیں۔

صنعتی انقلاب اور معاشرتی تگ و دو نے انسانوں کو اتنا مصروف کر دیا ہے کہ اب اس کے پاس طلسم ہوش ربا، داستان الف لیلہ، فسانہ آزاد اور ضخیم ناولوں کے پڑھنے کا وقت گھٹتا جا رہا ہے، وہ

مسلسل بھاگ رہا ہے، اس کے پاس بیوی بچوں کو دینے کے لئے بھی وقت نہیں ہے، ایسے میں مختصر قصہ نگاری نے عروج پایا، جسے ہم افسانے کے نام سے جانتے ہیں۔ پریم چند نے اسے زمینی حقائق سے جوڑا اور موضوعاتی اعتبار سے اسے انسانوں کے کام کا بنا دیا۔ یہ روایت آگے بڑھتی چلی گئی، پھر جدیدیت کا دور آیا اور علامتی قصے لکھے جانے لگے ایمائیت اور رمزیت کی وجہ سے قاری اور قصہ کا رشتہ کمزور ہوتا چلا گیا، ترقی پسندوں نے اسے معاشی مسائل سے جوڑا جس کی وجہ سے دوسرے بہت سارے مسائل پس پشت چلے گئے، اور اب ہم مابعد جدیدیت کے جس دور سے گذر رہے ہیں اس میں قصہ بڑی تیزی سے اپنی پرانی روش پر آتا چلا جا رہا ہے۔ اور یہ فن اب ارتقاء کی اس منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں اس میں قصہ پن بھی ہے اور ادبی رکھ رکھاؤ بھی۔ ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کے افسانوں میں صالح اسلامی قدروں پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

بہار میں مختصر قصہ نگاری کا فن ہر دور میں عروج پر رہا ہے، ہم فہرست سازی کر کے اسے طول دینا نہیں چاہتے، عصر حاضر میں شفیع مشہدی، شوکت حیات اور عبید قمر کا خاص طور پر نام لینا چاہوں گا، یہ حضرات اسلامی ادب کا پروپیگنڈہ نہیں کرتے، خاموشی کے ساتھ ان موضوعات پر قصہ لکھتے ہیں جو اسلامی اقدار اور مکارم اخلاق کے مطابق ہیں۔

ہمارے بعض قصہ نگاروں نے مختصر ترین قصہ نگاری کے فن کو رواج دیا جن میں قصہ کے اجزاء ترکیبی تو پورے طور پر پائے جاتے ہیں لیکن وہ قصہ سے زیادہ لطیفہ معلوم ہوتے ہیں۔ جیسے:

''دو گدھ نے ایک مردار کو دیکھا، ایک نے دوسرے سے کہا چلو! اپنے دوستوں کو بلا کر لاتے ہیں سب مل بانٹ کر کھائیں گے۔ دوسرے نے کہا مت بلاؤ! ہم دونوں دیر تک اس سے فائدہ اٹھائیں گے، پہلے گدھ نے کہا لگتا ہے یار تو بھی انسان ہو گیا۔''

اس میں قصہ پن بھی ہے، مکالمہ بھی ہے اور کلائمکس بھی صرف اس کے اختصار نے اسے لطیفہ بنا دیا ہے۔ قصہ کا یہ رنگ و روپ تیزی سے فروغ پا رہا ہے اور افسانچے کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔

تحریک ادب اسلامی نے قصوں کو مقصدیت کے اعتبار سے نئی جہت اور نئی بلندیوں سے روشناس کرایا، مائل خیر آبادی، طالب ہاشمی، ابن فرید وغیرہ کے قصے ہمارے ادب کا بیش قیمت اثاثہ

ہیں، جن کے ذریعہ سماج میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کو فروغ ملا اور ادب اسلامی کی اہمیت کو لوگوں نے سمجھا۔ عامر عثمانی نے مزاحیہ قصہ نگاری کو عروج بخشا، ''مسجد سے میخانے تک'' کے طویل سلسلے میں طنز و مزاح کی چاشنی کے ساتھ قصہ کا فن پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے، یہی وجہ ہے کہ قاری مطالعہ شروع کرنے کے بعد اسے ختم کئے بغیر نہیں رکھ سکتا۔

قصہ نگاری کا ایک بڑا حصہ نظموں اور مثنویوں کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، اس سلسلہ میں اسماعیل میرٹھی کی نظموں کا خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے جن میں قصہ اور حکایات کی شکل میں اخلاق حسنہ کی تبلیغ کی گئی ہے۔ یہاں میں شاہنامہ اسلام کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گا، جس میں اسلامی تاریخ اور وقائع کو نظم کیا گیا ہے۔ عربی اور فارسی قصوں سے ترجمہ کا کام بھی اردو ادب میں نمایاں رہا ہے، قرآنی قصوں پر بھی اردو میں بڑا کام ہوا ہے، اس سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی قصص القرآن کو ممتاز مقام حاصل ہے، اخلاق محسنی، اخلاق جلالی، کلیلہ ودمنہ، گلستاں و بوستاں کے قصے اردو نثر و نظم میں کثرت سے منقول ہیں اور مستقل کتابیں ان پر وجود میں آچکی ہیں، یہ کتابیں مقاصد کی ترسیل میں معاون ہونے کی حیثیت سے بہت اہم ہیں اور کردار سازی کے لئے انتہائی مفید بھی۔

مختصر یہ کہ اردو میں قصہ نگاری کا فن مختلف مراحل سے گذر کر ارتقا کی آخری منزل پر ہے، ضرورت ہے کہ موضوع کے اعتبار سے ان قصوں کو عوامی اور قاری سے قریب کرنے کی کوشش کی جائے، واقعہ یہ ہے کہ اردو قصوں کا قاری دن بدن الکٹرونک میڈیا کی وسعتوں میں کھوتا چلا جارہا ہے، پھر سے اس کی تلاش اور اس فن سے عوام وخواص کو جوڑنے کی کوشش کرنی چاہئے، ایک معاملہ قصوں کے موضوعات کا ہے، گلوبلائزیشن کے اس دور میں ساری دنیا کے مسائل ومشکلات، مصائب و پریشانیاں، واقعات وحالات، حوادثات ومعاملات ہمارے اپنے ہوگئے ہیں اور ہمارا قاری اس تلاش میں ہے کہ آج کا قصہ نگار کس طرح ان وسعتوں کو اپنے قصے میں سمیٹتا ہے اور یہ کام آسان نہیں ہے۔

عربی شاعری کے تنقیدی رجحانات

نقد کے معنی عربی میں اظہار عیوب اور نقائص اور ''**تمییز الجید من الردی**'' کے آتے ہیں، اس اعتبار سے دیکھیں تو نقد ذم کے ساتھ خاص ہے۔ بخلاف تقریظ اور مدح کے، لیکن ادبا کی اصطلاح میں ادب وشعر کی توضیح وتشریح اس انداز میں کرنا کہ ادبی شہ پارے غیر ادبی تخلیقات سے ممیّز وممتاز ہوجائیں اور ان تشریحات کی روشنی میں ان پر معیاری اور غیر معیاری ادب کا حکم لگایا جاسکے تنقید کہلاتا ہے، اسی لیے توضیح وتشریح اور نقد میں فنی، موضوعی اور دیگر خصائص حسن وعیب کا ذکر کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اردو میں عام طور پر نقد کے لیے تنقید کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، جس کا ماخذ یونانی لفظ (CRITICISM) ہے، جس کے معنی فیصلہ کرنے کے ہیں۔

تنقید کا یہ عمل تخلیق کو سنوارنے اور تخلیقی جوہر کو نکھارنے کے لیے ضروری ہے، اسی لیے نقادوں کا خیال ہے کہ عظیم تخلیقات، ممتاز تنقیدی شعور کے بغیر وجود پذیر نہیں ہوسکتیں، تخلیق کار کا تنقیدی شعور جتنا بالیدہ ہوگا، تخلیقی شعور اسی قدر وسعت اور گہرائی لیے ہوئے ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ تنقیدی شعور کے بغیر تخلیقی سوتے خشک ہوجاتے ہیں اور ادب فکر واظہار کی سطح پر آگے نہیں بڑھ پاتا، ایسے میں ادیب پرانی فکر، پرانی روایت کے گرد گردش کرتا رہتا ہے، ایسا ادب پر کشش نہیں ہوتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرانی چیزیں نقل کی جارہی ہیں۔

عربی شاعری اس لئے معیاری ہے کہ عرب شعراء کے یہاں تخلیقی شعور کے ساتھ تنقیدی شعور بھی پورے طور پر موجود ہے، البتہ عہد جاہلیت میں تنقید کے جو رجحانات ملتے ہیں، ان میں شعراء کے اقوال اور ذوق کو بنیادی حیثیت حاصل تھی اس کے لیے نہ کوئی اصول مقرر تھا اور نہ ہی متعین تنقیدی پیمانے، شعراء کے درمیان برتری کی جو جنگ جاری رہتی تھی، اس میں ایک دوسرے کی خامیوں پر رائے زنی کی جاتی تھی، کبھی اس رائے زنی میں فنی نقائص وعیوب بھی سامنے آجاتے تھے، لیکن عموماً بس اقوال

ہی ہوتے تھے اور قاری وسامع کی پسند، ناپسند ہی معیاری اور غیر معیاری تخلیق کے لیے کافی ہوا کرتی تھی، ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں تنقید کا پیمانہ صرف ذوق تھا، کبھی دوسرے عیوب بھی بنیاد بنتے تھے، لیکن ان کی حیثیت شاذ تھی۔

عصر جاہلی میں اس کام کے لئے سوق عکاظ میں باضابطہ سرخ رنگ کا خیمہ نصب ہوتا، نابغہ ذبیانی فیصل ہوتا، شعراء آتے اور اپنا کلام سنا جاتے، نابغہ اس پر رائے زنی کرتا، اور اپنا فیصلہ سناتا، ایک بار اعشیٰ میمون اور حسان بن ثابت نے بھی اس خیمے میں اپنا کلام پیش کیا، نابغہ نے اعشیٰ کے اشعار کو سراہا اور حسانؓ بن ثابت کے بارے میں کہا کہ اگر اعشیٰ کا کلام میرے سامنے نہ آتا تو میں تمہارے بارے میں جن وانس کے بڑے شاعر ہونے کا اعلان کرتا، حضرت حسانؓ کو غصہ آگیا اور فرمایا میں تم سے اور تمہارے باپ سے بڑا شاعر ہوں، نابغہ نے کلام کی فنی خوبیوں اور خامیوں پر بات نہیں کی، صرف اتنا کہا کہ تم اعشیٰ کے اس شعر کے مقابل شعر نہیں کہہ سکتے۔

فاِنَّکَ کَاللیلِ المُذِی ھُو مُدْرِکِی
واِنْ ظَنَنْتَ اَن المُتَنائی عَینکَ وَاسع

اسی طرح ایک موقع سے امرؤالقیس اور علقمہ بن عبدہ دونوں بڑے شاعر ہونے کے دعوے دار تھے، حکم امرؤالقیس کی بیوی ام جندب کو بنایا گیا، ام جندب کی تجویز پر دونوں نے گھوڑے کی تعریف میں قصیدہ کہا۔ امرؤالقیس کے قصیدہ کا مطلع تھا۔

خَلِیْلِی مَرابی علیٰ اُمّ جُنُدُبِ
نَقضِی لِبانات الفُوأدِ المُعَذّبِ

علقمہ بن عبدہ التمیمی نے اسی قافیہ وردیف میں قصیدہ کہا، جس کا مطلع تھا:

ذَھَبْتُ مِنَ الھِجْرَانِ فِی غَیْرِ مَذْھبِ
وَلَمْ یَکُ حَقاً کُلّ ھٰذا التجّنب

ام جندب نے فیصلہ دیا کہ علقمہ بڑا شاعر ہے، اس لیے کہ امرؤالقیس گھوڑے کو مار مار کر بھگاتا ہے اور علقمہ کی فکر میں گھوڑا ہوا کی طرح بھاگتا ہے۔ ام جندب نے جس شعر کی بنیاد پر علقمہ کو بڑا کہا

وہ درج ذیل ہے۔

فَلِلسوطِ الھوب وللساقِ دُرَّۃٌ
وللزجر منہ وقعُ اخرج مِنعَبِ

فَاَدْرَکَھُنَّ ثَانِیاً مِن عِنانِہِ
یَمُرّ کَمُرّ الرائحِ المُتَحَلِّبِ

ظاہر ہے یہ تنقید فنی نہیں، فکری ہے، حالانکہ ادبی تنقید میں فیصلہ کرتے وقت فکر وفن دونوں کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، لیکن عہد جاہلیت کے تنقیدی نمونے ہمیں اس سے خالی نظر آتے ہیں۔

جاہلی شعراء میں زہیر بن سلمیٰ حضرت عمرؓ کی نظر میں اس لیے ممتاز تھا کہ وہ اپنے مدحیہ اشعار میں مبالغہ سے گریز کرتا تھا اور واقعتاً جو اوصاف ممدوح میں ہوتے اسی کا ذکر کرتا، حضرت عمرؓ کے نزدیک اس کے ممتاز ہونے کی ایک وجہ اس کے کلام کی روانی بھی تھی۔ فرمایا:

"اِنَّہ اَشعَرُ الشُّعَراءِ لِانّہُ کَانَ لَا یُعاظِلُ فِی الکَلامِ وَکَانَ یتجّنب وَحُشِیَ الشِعْرِ وَلَمْ یَمْدَحُ اَحداً الا بِمَا ھُو فیہ.

اس دور میں جو تنقیدیں کی گئیں ان میں بعض اتنی مبہم ہیں کہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ مثلاً ربیعہ الخذار الاسدی زبرقان کے اشعار پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمہارے اشعار گرم گوشت کی طرح نیم پختہ اور نیم خام ہیں، نہ پورا پک سکا کہ اسے کھالیا جائے اور نہ کچا ہی ہے کہ کسی دوسرے کام میں لایا جاسکے۔

شِعْرُکَ کُلھُمْ لَمْ یَنْضَجْ فَیُؤکَلُ وَلَا تَرَکَ نیئاً فَیَنْتَفَعُ

ابن عبدہ کے اشعار کو وہ ایک ایسے گھڑے کی طرح قرار دیتا ہے، جس کا ڈھکن اتنی مضبوطی سے بند ہے کہ پانی کا کوئی قطرہ بھی اس سے باہر نہیں آسکتا۔

تنقید کے متعین پیمانے نہ ہونے کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ دور جاہلی کی شاعری فن کی پختگی کے اعتبار سے اعلیٰ شاعری کی بہترین مثال ہے، فنی اعتبار سے یہ دور فکر کی بلندی، منظر کشی اور فنی اعتبار سے بام عروج پر پہونچا ہوا نظر آتا ہے، طٰہٰ حسین کو یقین نہیں آتا کہ تنقیدی پیمانے نہ ہونے کے باوجود

عرب ایسی شاعری کس طرح کرتے تھے، چنانچہ ان کا خیال ہے کہ جاہلی قصائد اکثر بعد کے گڑھے ہوئے ہیں۔

دور جاہلیت کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ شعراء کے نام ان کی شاعری کی خصوصیات کے اعتبار سے رکھتے تھے، مہلہل بن ربعہ اس لیے مہلہل تھا کہ اس کی شاعری میں لطافت کا عنصر غالب تھا اور غریب و نامانوس الفاظ سے اجتناب کرتا تھا، ھلھلہ کے معنی کپڑے کے باریک بُننے کے آتے ہیں، اس لیے اس مناسبت سے وہ مہلہل کہلایا، نابغہ نے اشعار کی فصاحت کی وجہ سے نابغہ نام پایا، مثالوں کی کثرت کی وجہ سے کعب غنوی، ''کعب الامثال'' ہوگیا، اور گھوڑے کی تعریف کے غلبہ نے طفیل غنوی کو ''طفیل الخیل'' بنادیا، اوباش رند بلانوش اور شاہی خاندان سے تعلق کی وجہ سے امرؤ القیس، ''الملک الضلیل'' ہوگیا۔

دور جاہلیت میں تنقیدی پیمانے نہ ہونے کے باوجود تنقیدی شعور بہت پختہ تھا، اسی وجہ سے وہ الفاظ کے غلط استعمال، قافیہ کے حسن وقبح کو فوراً پکڑتے تھے، مشہور شاعر طرفہ نے مسیّب بن علس کے ایک شعر پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس نے اونٹ کی اونٹنی بنادیا، معاملہ صرف یہ تھا کہ اس نے اونٹ کی صفت کے طور پر ''صعیدیہ'' کا لفظ استعمال کرلیا تھا۔

اسی طرح نابغہ نے ایک شعر میں ''الاسودُ'' کے قافیہ کے ساتھ ''بالیدِ'' باندھا تھا، جس میں ایک پر پیش تھا اور دوسرے پر زیر، عربی تنقید کے اعتبار سے یہ اقواء تھا جو مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے، چنانچہ جب مدینہ میں ایک لڑکی نے اسے سنایا تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اس واقعہ کو وہ اتنی اہمیت دیتا تھا کہ کہنے لگا: میں مدینہ سے پلٹا تو سب سے بڑا شاعر تھا۔

اس پورے دور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ نثر میں تنقید کا وجود نہیں ہے، ساری توجہ فخر وحماسے ،معلقات، قصائد، تمثیلی، غنائی اور قصصی اشعار پر مرکوز رہی، نثر قابل اعتنا نہیں تھا۔ جنسی غزل جسے نسیب اور تشبیب بھی کہا جاتا ہے پر زور صرف کیا جاتا رہا، جو جاہلی معاشرے کی عکاس اور شعراء کے ذاتی جذبات واحساسات کی ترجمان ہوتے، اس دور کے نامور شعرا میں امرؤ القیس، عنترہ بن شداد، مہلہل بن ربیعہ تغلبی، عمرو بن کلثوم تغلبی، طرفہ بن العبد، لبید بن ربیعہ، درید بن الصمۃ، اعشٰی، لبید، طفیل الغنوی، اوس بن حجر،

ابوداؤد الایادی، خنساء، جلیلہ، سعدی بن الشمر ول، شامہ بن غدیر، مسیّب بن علس، اوس بن حجر، زہیر بن ابی سلمہ، نابغہ ذبیانی، عروۃ بن الورد، مرقش الاکبر، امیہ بن ابی الصلت کے نام لیے جا سکتے ہیں، یہ مختلف اصناف سخن کے نامور شعراء ہیں

دور جاہلی کا اختتام طلوع اسلام سے ہوتا ہے، اسلام نے زندگی گذارنے کے لیے جو صالح قدریں فراہم کیں، وہ زندگی کے ہر شعبے کو محیط ہیں، ادب وشاعری اور تنقید کے بھی اس نے اصول دنیا کو دیے، قرآن کریم میں شعراء کے سلسلے میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُوْنَ . اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ. وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْن (الشعراء: ۲۳۶ . ۲۳۴)

شاعروں کی پیروی وہ کرتے ہیں جو بھکے ہوئے ہوں، کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ شاعر ایک ایک بیابان میں سرٹکراتے پھرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں جو کرتے نہیں ہیں۔

علامہ جاراللہ زمخشری اپنی مشہور ومعروف تفسیر کشاف میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَمَعْنَاهُ اَنْ لَا يَتَّبِعَهُمْ عَلٰى بَاطِلِهِمْ وَكِذْبِهِمْ وَفُضُوْلِ قَوْلِهِمْ وَمَا هُم عَلَيْهِ مِنَ الهجاء ومَزِيقِ الاعراض وَالْقَدْحِ فِیْ الانسابِ وَمَدْحِ مَنْ لَا يَسْتَحِقُّ المَدْحَ وَلَا يَسْتَحْسِنُ ذٰلِكَ مِنْهُمْ وَلَا يَطْرَبُ عَلٰى قَوْلِهِم اِلا الغاوُوْن. (ص ۲/۱۳۵)

''اس کے معنی یہ ہیں کہ شعراء کی باطل گوئی، کذب بیانی، فضول گوئی، ہجو، آبروریزی، نسب میں عیب جوئی، نااہل کی مدح وغیرہ میں ان کی اتباع اور اسے مستحسن صرف وہی لوگ سمجھتے ہیں؛ جو بھکے ہوئے ہیں۔''

ادب وشاعری میں ان خرابیوں کی وجہ سے ہی بقول حضرت عائشہؓ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ ابغض الحدیث تھا، مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ پیٹ کا پیپ سے بھر جانا بہتر ہے اس بات سے کہ تمہارا پیٹ شعر سے بھر جائے۔ (لان يَّمْلِي جَوْفَ اَحَدِكُمْ قيحا خَيْرٌ لَّهُ مِنْ اَن يَّمْتَلِي شِعْرًا) مسند احمد کی ایک روایت میں جس کے اسناد پر محدثین نے کلام کیا ہے، یہ بھی ہے کہ جس نے عشاء کے بعد شعر گوئی کی اس کی اس رات کی نماز قبول نہیں ہوتی ''وَمَنْ قَرَضَ بَيْتَ شِعْرٍ

بَعْدَ العِشَاء لَمْ تُقْبَلْ صَلوٰةُ تِلْکَ اللَّیْلَةِ" اوراسی وجہ سے قرآن کریم نے نبی کے شایان شان شاعری کونہیں قرار دیا۔ وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ وَمَا یَنْبَغِیْ لَهُ (یٰسین) ہم نے ان کونہ شعر سکھایا اور نہ یہ ان کے لیے مناسب ہے۔

خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع سے ارشاد فرمایا نہ میں شاعر ہوں اور نہ ہی مجھے یہ زیب دیتا۔(اِنّی لستُ بِشَاعِرٍ وَلَا یَنْبَغِی لِی)

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سارا ادبی وشعری سرمایہ اور ساری تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتیں اسلام کے منافی ہیں، قرآن کریم نے شعراء کی مذمت کے معا بعد ان شعراء کا استثناء کیا ہے جو ان صفات سے مزین نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ کو یاد کرنے والے اور ایمان وعمل صالح کی صفت سے مزین ہیں اور وہ ادب وشعر کا استعمال مظلومی کے بعد انتقام کے لیے کرتے ہیں۔

اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَذَکَرُو اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوا (الشعراء:۲۲۷)

سوائے ان کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے اور بکثرت اللہ کا ذکر کیا اور اپنی مظلومی کے بعد انتقام لیا۔

علامہ جاراللہ زمخشری لکھتے ہیں:

اُسْتُثْنَی الشُّعَرَاء المؤمنون الصالحون الَّذِیْنَ یَکْثُرُوْنَ ذِکْرَ اللہِ وَتِلَاوَۃَ الْقُرْآن وَکَان ذالک اَغْلَبَ عَلَیْهِمْ مِنَ الشِّعْرِ وَاِذَا قَالُوْ شِعْراً قَالُوْہ فِیْ تَوحِیْدِ اللہ وَالثناءِ عَلَیْهِ وَالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ وَالزُّهْدِ وَالأداب الحَسَنَةِ وَصُلَحَاءِ الْاُمَّةِ وَمَا لا بَاْسَ بِهِ مِنَ الْمَعَانِی الَّتی لَا یَتَلَطَّخُوْنَ فِیْهَا بِذَنْبٍ وَلَا یَتَلَبَّسُوْنَ بِشَائِبَةٍ وَلَامَنْقَصَةٍ وَکَانَ هِجَاؤهُم عَلیٰ سَبِیْلِ الانتصار مِمَّنْ یَهْجُوْهُمْ (کشاف ۳/۱۴۵)

ان مؤمنین صالحین شعراء کو مستثنیٰ قرار دیا گیا جو بکثرت اللہ کا ذکر اور تلاوت کرتے ہیں، اور یہ چیز ان کے اوپر شعر کے مقابلے میں غالب رہتی ہے اور جب وہ کوئی شعر کہتے ہیں تو وہ توحید الٰہی، اس کی ثنا، حکمت وموعظت دنیا سے بے رغبتی، آداب حسنہ، صحابہ، صلحاء امت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہتے ہیں اور ایسا شعر کہتے ہیں، جس میں گناہ کی آمیزش نہیں ہوتی اور نہ ہجو اور مذمت کا شائبہ ہوتا ہے اور ان کے ہجو کے اشعار ان لوگوں سے انتقام کے طور پر ہوتے ہیں۔

ان خصوصیات کے ساتھ جو اشعار کہے جاتے ہیں اس کے بارے میں آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ زبان کا جہاد ان کے قلوب کو نیزوں کی طرح چھلنی کرتا ہے۔

وَالّذی نَفْسِی بِیَدِهٖ لَکَاَنَ مَا تَرمُونَهُم بِه نَضْح النَبُلِ

قسم اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ زبان کا جہاد ان کے قلوب کو نیزوں کی طرح چھلنی کرتا ہے۔

ایک اور موقع سے ارشاد فرمایا:

خَلِّ عَنہ یَا عُمَرُ! فَهِیَ اَسْرَعُ مخصومٍ مِن نُضْحِ النُبُلِ

عمر! اس کو چھوڑ دو کیونکہ یہ نیزہ کے زخم سے زیادہ سریع الاثر ہے۔

ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی ہجو کا حکم دیا اور فرمایا:

اُهجو قریشا ، فَاِنّه اَشَدُّ عَلَیْهِمْ مِنْ رَشْقِ النُبُلِ.

قریش کی ہجو کرو اس لیے کہ یہ ان کے لیے نیزے کے زخم سے زیادہ سخت ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ سِحْرًا. وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ حِکْمَةً.

بے شک بعض بیان جادو کا اثر رکھتا ہے اور بعض شعر پر از حکمت ہوتا ہے۔

ان روایات واحادیث سے شعر کی تاثیر اور غیر معمولی اثر کا پتہ چلتا ہے، اور اس کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تنقید میں اس کی توضیح ہونی چاہیے کہ اس ادب نے سماج کو کس قدر متاثر کیا اور اس کے کس قدر دور رس اثرات مرتب ہوئے۔

عہد اسلامی اور عہد نبوی میں شاعری کا زور تھا، قصے اور مسامرۃ کی مجلسیں بھی منعقد ہوتی تھیں، مرثیہ خوانوں اور حدی خوانوں کا بھی اپنا سُر اور لے تھا اور ان کے ذریعہ بھی مقفع مسجع عبارتیں وجود میں آجاتی تھیں، لیکن ان کی طرف توجہ کم تھی اور تنقید کی کسوٹی جس درجہ کی بھی تھی اس پر اسے نہیں پرکھا جاتا تھا، البتہ شعر وشاعری وجہ تفاخر بھی تھا اور وجہ تنازع بھی، عشق وہجر کے قصے وصال کی باتیں، محبوبہ کے فراق کی بے کلی وبے بسی کا اظہار، شاعری کے ذریعہ ہی ہوتا تھا اس لیے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعار پر تنقید مقصدیت کے اعتبار سے کیا، اور شاید پہلی بار ادب برائے ادب کے بجائے ادب

برائے زندگی کا تصور سامنے آیا۔

اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو ایک آدمی بڑا شاعر ہوسکتا ہے، اس کی شاعری میں فنی پہلو بھی غالب ہے، لیکن وہ مقصدی شاعری نہیں ہے، بلکہ اس نے فحش اور عریاں مضامین کو نظم کر دیا ہے، اس لیے ہم انہیں فن کے اعتبار سے ممکن ہونے کے باوجود مقصدیت سے دور ہونے کی وجہ سے اس پر ادبی شہہ پارے کا حکم نہیں لگا سکتے، یہ تفریق پہلی بار آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے سامنے آتی ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امیہ بن صلت کے اشعار اس کی بہن فارعہ کی زبانی سن کر ارشاد فرمایا: اس کا شعر ایمان لے آیا، لیکن اس کے قلب نے کفر کیا (آمنَ شِعرُہُ کَفَرَ قَلْبُہُ)

ان ارشادات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ اسلام بنیادی طور پر شعر و ادب کا مخالف نہیں ہے، مقصد نیک نہ ہو تو شاعری شیطان کا آلۂ طرب ہے اور مقصد نیک ہو تو وہ تائید الٰہی کا ذریعہ ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ سے جو تنقیدی اصول سامنے آتے ہیں، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کلام میں چرب زبانی، بے جا تکلف، فخریہ اور متکبرانہ جملے سے احتراز، سادگی، سنجیدگی، سہل نگاری، ایجاز اور لوگوں کی ذہنی سطح سے قریب تر الفاظ کا انتخاب ہونا چاہیے، اسی لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کَفَاکَ اللّٰہ مَا اَھَمَّکَ (اللہ تعالیٰ تمہاری ضرورت پوری کرے) عَصَمَکَ اللّٰہُ مِنَ الْمَکَارہُ (اللہ تمہیں برائیوں سے بچائے) جیسے جملوں کو سن کر ھٰذِہٖ الْبَلَاغَۃ کہہ کر بلیغ ہونے کی سند عطا فرمائی۔ بہت مسجع عبارت جو نفس مطلب تک پہونچنے میں مخل ہو کو ناپسند فرمایا (اسَجْعاً کَسَجْعِ الکھّانَۃِ (کیا کاہنوں کی طرح مسجع عبارت میں بات کرتے ہو۔) بے جا تکلف و تصنع کو بھی پسند نہیں فرمایا اور اسے ہلاکت کا سبب قرار دیا۔ ھَلَکَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ (بناوٹ سے باتیں کرنے والے ہلاک ہوئے) اور اِیَّاکَ وَالتَّشَادُقَ (کلام میں بے جا تکلف سے بچو) کہہ کر واضح کر دیا کہ یہ کوئی پسندیدہ چیز نہیں ہے۔

ان اصولوں کی روشنی میں جن حضرات کی شاعری سامنے آئی، انہیں بارگاہ رسالت سے پسندیدگی کی سند ملی، حمزہ بن عبدالمطلب، علی بن ابی طالب، کعب بن مالک، حسان بن ثابت، عبداللہ رواحہ، عبیدہ بن الحارث عہد نبوی کے ممتاز شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔

اس پورے دور کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کی شاعری پر مقصدیت غالب ہے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو حق کے موافق ہے وہ خوب ہے اور جو حق کے مخالف ہے اس میں کوئی خیر نہیں۔

اِنّھا الشِعْرُ کَلَام'' مؤلف'' فَمَا وافقَ الحقُّ مِنْہُ فَھُوَ حَسَن'' ومَالَمْ یُوَافِقِ الحَقَّ مِنْہُ فَلَا خُیْرَ فِیْہِ.

فرمایا شعر کلام ہی ہے، کلام اچھا بھی ہوتا ہے اور برا بھی (اِنَّمَا الشِّعْرُ کَلَام فَمِنَ الکَلَامِ خَبِیْث'' وطیب) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی وجہ سے صحابہ کرام میں ادبی ذوق، صالح قدروں کے ساتھ پروان چڑھا، حضرت عائشہ صدیقہؓ دینی علوم کے ساتھ اشعار کی بہترین پارکھ اور نسب کی بڑی جانکار تھیں، خود بھی فصیح گفتگو کرتی تھیں، موسیٰ ابن طلحہ کا بیان ہے:

مَارَأیتُ اَحداً اَفْصَحُ مِنْ عَائِشَۃَ میں نے عائشہؓ سے زیادہ فصیح کسی کو نہیں دیکھا۔

ہشام بن عروۃ فرماتے ہیں:

مَا رَأیتَ اَحداً مِنَ النَّاسِ اَعْلَمُ بِالْقُرآنِ وَلَا بِفَرِیْضَۃٍ وَلَا بِحَلَالٍ وَحَرَامٍ وَلَا بِشِعْرٍ وَلَا بِحَدِیْثِ الْعَرَبِ وَلَا النَسَبِ مِنْ عَائِشَۃَ. میں نے لوگوں میں سے کسی کو حضرت عائشہؓ سے زیادہ قرآن میراث، حلال وحرام، شعر، واقعات عرب اور نسب کا جانکار نہیں دیکھا۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کی طرف بھی بہت سے اشعار منسوب ہیں، طبری میں حضرت عبداللہ بن زبیرؓ نے اس کی تردید کی ہے ان کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کبھی کوئی شعر نہیں کہا، لوگ دروغ گوئی سے کام لیتے ہیں۔ مَا قَالَ اَبُو بَکْرٍ شِعْراً قَطُّ وَلٰکِنَّکُمْ تُکَذِّبُوْنَ عَلَیْہِ اس بات سے قطع نظر ان کا ذوق شعری انتہائی بالیدہ تھا اور شعراء کے مابین معرکہ کی رودادیں اور اشعار انہیں کثرت سے یاد تھے، کئی موقعوں پر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اشعار سنائے اور اس معرکہ کی پوری روداد سنا ڈالی۔

حضرت عمر فاروق کا موقف شاعری کے سلسلے میں دوسرے صحابہ کرام کی بہ نسبت زیادہ واضح تھا، انہوں نے اپنے صاحب زادہ کو نصیحت کیا تھا کہ ادبی ذوق میں نکھار پیدا کرنے کے لیے اچھے

اشعار یاد کرو، کیونکہ اس کے بغیر ادبی ذوق نہیں نکھرتا۔

وَاحْفَظْ مَحَاسِنَ الْشِعْرِ لِحُسْنِ اَدَبِکَ وَمَنْ لَمْ یَحْفَظْ مَحَاسِنَ الشِّعْرِ لَمْ یُوْدِّ حَقّاً وَلَمْ یُحْسِن اَدَباً. (تاریخ القصة و النقد: ۱۱۶)

وہ چاہتے تھے کہ لوگ اشعار یاد کریں اس کے رموز ونکات سے واقفیت بہم رکھیں، کیونکہ اس سے اخلاق بلند ہوتا ہے، رائے درست ہوتی ہے اور علم الانساب کی معرفت بھی اس کے ذریعہ ہوتی ہے، انہوں نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو اپنے دور خلافت میں لکھا۔

"مُرْ مِنْ قَوْمِکَ بِتَعَلُّمِ الْشِعْرِ فَاِنَّهُ یَدُلُّ عَلَی مَعَالِ الْاَخْلَاقِ وَصَوَابِ الرَّایِ وَمَعْرِفَةِ الاَنْسَابِ"(تاریخ القصة والنقد : استاذ السباعی ، بیومی مطبوعة مصر ۱۹۵۶، ۱۱۶)

یہ حضرت عمرؓ کی تنقیدی بصیرت ہی کی بات ہے کہ انہوں نے نابغہ ذبیانی کو اشعر العرب اور زہیر بن ابی سلمیٰ کو اشعر الشعراء کا خطاب دیا؛ کیوں کہ ان کے خیال میں زہیر تعقیدات، غرابت الفاظ اور مدح بے جا سے اجتناب کرتا ہے۔("اِنَّهُ یُعَاظِلُ بَیْنُ الْقُوْلِ وَلَا یَتَّبَعَ حُوشَی الکَلامِ وَلَا یَمْدَحُ الرَّجُلَ اِلَّا بِمَا هُوَ فِیْهِ.(الشعر والشعراء اول :۶۷، العمده اول:۹۸) اس سلسلے کی تفصیلات ابوالفرج اصفہانی کی کتاب "الاغانی" اور ابن قتیبہ کی کتاب "الشعر والشعراء" میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

اسی طرح حضرت حسانؓ، ابو ذویب الھذلی کو زندہ شاعروں میں بڑا شاعر سمجھتے تھے اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے حطیہ کو اشعر الشعراء کا خطاب دیا تھا، دیگر صحابہ کرام میں حضرت عثمان غنیؓ کی فصاحت و بلاغت اور الفاظ کی موزونیت ضرب المثل تھی، حضرت علیؓ نثر ونظم دونوں کے مرد میدان تھے، مشہور مؤرخ اور ناقد حسن زیات کے بقول وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے زیادہ فصیح اللسان واقع ہوئے تھے، ان کے بعض اشعار حدیثوں میں مذکور ہیں، جس سے ان کے تخیل کی بلندی اور حسن الفاظ کے انتخاب کا پتہ چلتا ہے، جنگ خیبر میں آپ کا یہ رجز یہ شعر بہت مشہور ہوا۔ جس کا مفہوم ہے کہ میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا، میں خوفناک گھنے جنگل کے شیر کی طرح ہوں۔

اَنَاالذی سَمَتْنِی اُمّی حیدرةً

کَلَیْثِ غاباتٍ کریهِ النَظْرَةِ

(خلفاء راشدین اول:۳۳۵ معین الدین ندوی)

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے عہد میں تنقید صرف ذوقی چیز نہیں رہ گئی تھی؛ بلکہ تنقید کی بنیادیں سامنے آنے لگی تھیں، فکر کی پاکیزگی، مقصدیت، الفاظ کے دروبست، تنافر حروف اور غرابت الفاظ سے اجتناب بحر کے اعتبار سے رواں، جدت خیال وغیرہ کو بھی اشعار پر حکم لگاتے وقت سامنے رکھا جانے لگا تھا، اس سلسلے میں عہد جاہلیت میں حضرت حسان کے پسندیدہ شعر پر حضرت خنساؓ کی مشہور تنقید کتابوں میں ملتی ہے۔ حضرت حسانؓ کا شعر تھا۔

لَنَا الجَفَنَاتُ الغُرّ یَلْمَعْنَ فِی الضُحیٰ

وَاَسْیَافُنَا یَقْطُرْنَ مِنْ نجدةٍ دماً

اس ایک شعر میں حضرت خنساء نے سات کمیاں نکالیں، انہوں نے کہا کہ جفنات کے بجائے جفان اور غر کے بجائے بیض کہنے سے معنی میں وسعت پیدا ہو جاتی، کیونکہ جفنات جمع قلت اور غر صرف پیشانی کی صباحت سے عبارت ہے، اسی طرح ضحیٰ کے بجائے دجیٰ اسیاف کے مقابلے میں سیوف یقطرن کے بجائے یسلن اور دم کے بجائے دماء کا استعمال زیادہ مناسب تھا، یلمعن عارضی چمک کو کہتے ہیں اس لیے یشرقن مناسب تھا، کیونکہ اشراق میں زیادہ پائیداری ہے۔

ان تنقیدی اصولوں کے سامنے آنے سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عربی شاعری تعقیدات، فحش استعارے کنایے، اور ثقیل اور گنجلک اسلوب سے بڑی حد تک پاک ہوگئی، اور اشعار کی تنقید میں ان پیمانوں کا خیال رکھا جانے لگا۔

اموی دور میں نقد شعر میں تھوڑی پیش رفت ہوئی، بقول احمد امین: تنقید نے ادب کے شانہ بشانہ ترقی کی، اسی دور میں جریر وفرزدق اور اخطل اپنی باہمی رقابت اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے اور دوسرے کو نیچا دکھانے کی غرض سے عربی شاعری کو نئے الفاظ وتعبیرات سے مالا مال کر رہے

تھے، لوگوں میں اچھے شعر کو سمجھنے اور اس سے لطف اٹھانے کا خصوصی ملکہ پیدا ہو رہا تھا، اور تنقید کے اصول ومبادی سامنے آنے لگے تھے۔ عرب تنقید نگاروں نے عہد جاہلی سے لیکر عہد اموی تک فن تنقید میں جو مراحل آئے اسے المرحلۃ التاثریہ سے تعبیر کرتے ہیں، عہد عباسی سے عربی تنقید میں نیا مرحلہ شروع ہوتا ہے، جسے المرحلۃ التعلیلیہ کہا جاتا ہے، یہ مرحلہ اس اعتبار سے ممتاز ہے کہ اس دور میں تنقید کے اصول واضح طور پر مرتب کیے گیے، منہجی اور غیر منہجی تنقید کے نمونے سامنے آئے، اس مرحلہ کو آگے بڑھانے میں جن لوگوں نے نمایاں حصہ لیا، ان میں محمد ابن سلام الجمحی ابن قتیبہ، ابن معتز اور قدامہ بن جعفر کے نام سرفہرست ہیں۔

ابن سلام الجمحی (م ۲۳۱ھ) نے پہلی بار متقدمین اور معاصرین کی تنقیدی آرا وافکار کو اپنی کتاب "**طبقات فحول الشعراء**" میں پیش کیا، اور شعراء کے دس طبقات مقرر کیے اور ان کے اشعار کو فن کی کسوٹی پر پرکھ کر عملی تنقید کی بنیاد ڈالی، مسئلہ انتحال کو بھی پہلی بار ابن سلام نے ہی اٹھایا۔

ابن قتیبہ (م ۲۷۶ھ) نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنی کتاب "الشعر والشعراء" میں نقد شعر کے قواعد وضع کیے اور اشعار کو چار زمرے میں تقسیم کیا، اور معیار حسن لفظی اور معنوی کو قرار دیا، انہوں نے لکھا کہ پہلی قسم ان اشعار کی ہے جس میں حسن لفظی اور معنوی دونوں ہوتا ہے، دوسری قسم ان اشعار کی ہے جن میں حسن لفظی تو ہے، لیکن معنی غیر معیاری ہیں، تیسری قسم میں مضمون تو معیاری ہوتے ہیں لیکن الفاظ میں ترسیل کی کمی ہوتی ہے اور جن اشعار میں لفظ ومعنی دونوں معیاری ہوں تو وہ شعر کی چوتھی قسم ہے۔

اسی دور میں ابوالعباس مبرد (۲۸۶۔۲۱۰) کی کتاب "کامل"، ابن معتز کی کتاب "البدیع" اور ابن طباطبا کی کتاب "عیار الشعر" سے تنقید میں فنی معیار کی اہمیت اور عربی زبان وادب کے محاسن تفصیل سے سامنے آئے۔

تیسری صدی ہجری کے نصف اخیر میں ارسطو کی کتاب Rhetorics کا ترجمہ "الخطابۃ" اور Poetics کا ترجمہ "کتاب الشعر" کے نام سے سامنے آیا، جس نے پہلی بار عربی تنقید میں فلسفیانہ عنصر کی شمولیت کا دروازہ کھولا، گو جاحظ نے عربی تنقید پر اس کے اثرات سے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ

عربوں نے ارسطو کے خیالات کو سمجھا ہی نہیں اور اس کے افکار کی باریکیوں تک عربوں کی رسائی نہیں ہو سکی۔

لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدامہ بن جعفر (م ۳۳۷) کی کتاب "نقد الشعر" میں یونانی فلسفہ کا عنصر غالب ہے اور اسے عربی شاعری پر منطبق کرنے کی انہوں نے مسلسل کوشش کیں، اس طرز عمل سے تنقید کے فن اور منہج کو کافی نقصان پہونچا، سید قطب نے قدامہ کی اس کوشش کو تنقید کے اعتبار سے ناکام قرار دیا ہے، ان کے نزدیک ابن بشر الآمدی اور ابوالخثم جرجانی کی خدمات قدامہ بن جعفر سے زیادہ وقیع ہیں۔

ابن بشر الآمدی (۳۷۱) اور علی بن عبدالعزیز الجرجانی (م ۳۹۲ھ) نے بالترتیب اپنی کتاب "**الموازنة بين الطائيين**" ابی تمام والبحتری اور **الوساطة بين المتنبی وخصومه** کے ذریعہ فنی منہج کی بازیافت کی، جس سے تعبیری ومعنوی قدروں کی اہمیت سامنے آئی، الفاظ کے محاسن وعیوب اور معانی سے بحث کرکے پسند وناپسند کا ایک معیار قائم کیا۔ اس کے باوجود ایک زمانے تک صورت حال یہ رہی کہ نقادان فن اور علماء بلاغت میں تمیز نہیں کیا جاتا تھا، تنقیدی آرا بلاغت کے عام مباحث کے ساتھ اس طرح خلط ملط ہو گئے تھے کہ ان میں حد فاصل کھینچنا مشکل تھا، ابو ہلال عسکری کی کتاب الصناعتین اور عبدالقاہر جرجانی (م ۴۷۸ھ) کی کتاب دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ ابن رشیق القیروانی (م ۴۶۳ھ) کی "العمدۃ فی صناعۃ الشعر ونقدہ" ادبی تنقید اور بلاغت کو ایک ساتھ جمع کرنے کی عمدہ کوشش ہے شوقی ضیف کے بقول ابن رشیق نے قدیم نقادان فن کی آرا اور تعلیقات کی تلخیص اس کتاب میں عمدہ انداز میں پیش کیا ہے۔

ابن خلدوں کے بقول:

هُوَ الکِتَابُ الذّی اِنْفَرَدَ بِصَنَاعَةِ الشِعْرِ واِعطاءِ حَقِّها وَلَم یَکْتُبْ فِیْها اَحَد" قَبْلَهُ وَلَا بَعْدَهُ مِثْلَهُ.

یہ کتاب صنعت شعری اور اس کی تفصیلات پر ایسی کتاب ہے جو اس سے پہلے اور بعد کسی نے نہیں لکھی۔

ابن رشیق کے بعد چھٹی صدی ہجری تک اس میدان میں سناٹا نظر آتا ہے، ساتویں صدی ہجری میں ابن اثیر (۶۳۷ھ) کی کتاب ''المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر'' سامنے آئی اس کتاب نے تنقید کے سمندر کے پرسکون سطح میں تھوڑا تموج پیدا کیا، حازم القرطاجنی کی کتاب منہاج البلغاء وسراج الادباء بھی قابل قدر کوشش ہے، جس نے تنقید کو روبہ زوال ہونے سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس زوال پذیر دور کا اختتام اور عربی تنقید کی نشأۃ ثانیۃ شیخ حسین المرصفی کی کتاب ''الوسیلۃ الادبیۃ للعلوم العربیۃ''، سے ہوئی، نحو وصرف، بیان وبدیع، شعر ونثر پر مشتمل ان کے یہ لیکچرز زبان وادب سیکھنے میں بڑے معاون ثابت ہوئے اور المنہج النقدی والتقلیدی کو حیات نو عطا ہوئی، انہوں نے قدامہ کی تعریف **شعر انه الکلام الموزون المقفی** میں وسعت پیدا کیا اور فرمایا:

اِنَّ الشِعْرَ هُوَ الكَلَامُ البَلِيْغُ
المَبْنِيُ عَلى الاِسْتِعَارَةِ وَالاَوْصَافِ
الْمُفَصّلِ بِاَجْزَاءٍ متفقةٍ فِي الوَزَنِ
وَالروی مستقل كل جزؤ منها في
غرضه ومقصده عما قَبْلَه وَبَعْدَه
الجارِی عَلیٰ اَسَالِيْبِ العَرَبِ
المَخْصُوصَةِ بِهِ

شعر وہ موثر کلام ہے جو استعارہ کے
ساتھ وزن وروی کے اندر تمام متفقہ صفات
مشتمل ہو اور اس کا ہر حصہ اپنے غرض وغایت مین
جو اس سے پہلے یا بعد میں ہو عرب کے خاص
اسلوب پر منطبق ہوتا ہو، مستقل ہو۔

روایتی ادب کو نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ سمجھ کر ''مدرسۃ الدیوان'' وجود میں آیا جس کے بانی عبدالرحمٰن شکری، عبدالقادر مازنی اور عباس محمود ہیں، ان حضرات نے مغربی ادب کے مطالعہ کے بعد جدید کلاسیکی شعراء پر سخت تنقیدیں کیں اور '' **اَلَا یَا طَائِرَ الْفِرْدَوْسِ اِنّ الشعر وِجُدان** '' '' کے ذریعہ نئی کلاسیکی شاعری سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔

یہی وہ دور ہے جس میں میخائیل نعیمہ ''کتاب الغربال'' لے کر میدان میں آئے اور انہوں نے موضوعی منہج کے بجائے ذاتی منہج کو پروان چڑھایا اور اس کی اساس، نقاد کی قوت تمیزی اور ذوق

شعری کو قرار دیا، اس تجدیدی رجحان کو مدرسۃ الدیوان، جماعت اپولو اور مہجر سے مربوط شعراء نے پروان چڑھایا۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں نت نئے افکار کے سامنے آنے، اشتراکیت کے بال وپر پھیلانے اور وجودیت کے عملی انداز میں زیر بحث آنے سے ایک نیا تنقیدی منہج سامنے آیا، جس کے نتیجے میں تفسیری، تفہیمی اور توجیہی مذاہب سامنے آئے، اور الگ الگ انداز میں تنقیدی رجحان کو اپنایا جانے لگا، اس دور میں یحیٰی حقی، زکی مبارک، طٰہٰ حسین کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں، ان حضرات کی تنقیدوں میں مغربی اور فرانسیسی ادب کے تنقیدی اصولوں کو برتنے کے ساتھ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا جذبہ بھی شامل نظر آتا ہے:

عربی شاعری کے پورے تنقیدی سرمایے پر نظر ڈالنے سے ہم اس نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ شروع ہی سے عربی تنقید میں عملی اور نظری تنقید کے نمونے ملتے ہیں۔ گو نظری تنقید زیادہ ترقی یافتہ شکل میں عربی میں موجود ہے، چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں قدامہ بن حعفر ابن المعتز وغیرہ نے جو کتابیں لکھیں ان سب میں عربی تنقید کے نظریات زیر بحث آئے ہیں، عملی تنقید پر کتابیں عربی میں کم لکھی گئی ہیں، لیکن تذکرے تراجم شعراء، وغیرہ میں جو تنقیدی بحثیں نظریاتی کی گئی ہیں، اس نے تنقید کو اصولی انداز بخشا۔

عربی شاعری میں بھی اردو شاعری کی طرح نت نئے تجربے کیے گیے، رمزیہ شاعری، نثری شاعری، آزاد شاعری کے نمونے سامنے آنے لگے تو تنقید کو نئی جہت اور نئے رجحانات کو سامنے رکھ کر اپنے کام کو آگے بڑھانا پڑا اور نقادوں نے الشعر الحر، شعر تفعیلیہ الشعر المنثور کے نام سے اسے متعارف کرایا، لیکن جس طرح آزاد غزل ونظم اردو ادب میں پابند شاعری کا مقابلہ نہ کر سکی، عربی کے بڑے بڑے ادباء شعراء اور نقاد نے اسے بھی یک سر مسترد کر دیا۔

اس باب میں عجیب وغریب تجربے کیے گیے، نازک الملائکہ، بدر شاکر السیاب، عبدالوہاب البائی، نزاد قبالی، علی احمد باکثیر، محمد فرید اور ابو حدید اور نے اس طرح کے تجربات کو جاری رکھا اور بعض نے شاعری کو اہرام کی شکل دیدی پہلے مصرع میں ایک رکن، دوسرے میں دو اور چوتھے پانچویں مصرعے

میں چار چار رکن کے ذریعہ الشعر الحر کا ملغوبہ تیار کیا، جس نے قبول عام حاصل نہیں کیا۔

مہجری شعراء وادباء نے الرابطہ القلمیۃ (سن تاسیس ۱۹۲۰) اور العصبۃ الاندیسیۃ (۱۹۳۰ء) کے نام سے ادبی انجمن قائم کرکے عربی زبان وادب، تنقید اور دوسرے اصناف کو عرب سے باہر پروان چڑھایا، ان انجمنوں کے ذریعہ عربی کو پھیلنے کے لیے نئی بستیاں ملیں اور عربی کی نئی آبادیاں وجود میں آئیں۔

ہندوستان میں عربی ادب سے متعلق پہلی تنقیدی کتاب تذکرہ کی شکل میں سامنے آئی، تذکرۃ الشعراء کے نام سے مولوی کریم الدین پانی پتی (۱۸۷۱ء) نے اسے مرتب کیا تھا اور ۱۸۴۷ء میں مطبع العلوم مدرسہ دہلی سے اشاعت پذیر ہوئی تھی، یہ کتاب اصلاً ڈاکٹر اشپرنگر (۱۸۹۳ء) پرنسپل مدرسہ دہلی اور سکریٹری اردو سوسائٹی کی تحریک پر فرائد الدھر کے نام سے عربی میں تیار کی گئی تھی، جس کی اشاعت نہیں ہوسکی، تذکرہ شعراء ادب اسی کا اردو ترجمہ ہے، ڈاکٹر زبید احمد کی دو کتابیں ایک کنٹری بیوشن آف انڈیا ٹو عربک لٹریچر اور ادب العرب کا شمار بھی ہندوستان میں لکھی گئی پرانی کتابوں میں ہوتا ہے، ادب العرب ۱۹۲۶ء میں الہ آباد سے شائع ہوئی تھی، ڈاکٹر سید ابوفضل پروفیسر عثمانیہ یونیورسیٹی حیدرآباد کی مختصر لیکن اہم کتاب تاریخ ادب شاعری، پروفیسر عبد الصمد صارم کی کتاب ''شعر العرب'' اسی سلسلۃ الذھب کی کڑی ہے جو ۱۹۶۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی ان علاوہ ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری کی کتاب مختصر تاریخ ادب عربی، پروفیسر خالد حامدی کی کتاب ''عربی زبان وادب ایک تاریخی مطالعہ''، پروفیسر عبد الحلیم ندوی کی کتاب عربی ادب کی تاریخ اپنے مشمولات کے اعتبار سے تاریخ اور تذکرے پر مشتمل ہے، لیکن شعراء کے بیان میں تنقیدی افکار بھی جابجا ان کتابوں میں ملتے ہیں، پروفیسر سید احتشام ندوی کی دو کتابیں ''عربی تنقید کا ارتقاء اور فن موازنہ'' کا ارتقاعربی تنقید کے حوالے سے اہم کتاب ہے، علی گڈھ سمینار کے مقالات کا مجموعہ النقد الادبی العربی بین القدیم والحدیث مرتبہ پروفیسر سید کفیل احمد قاسمی، پروفیسر محمد صلاح الدین العمری اور ڈاکٹر شمس کمال انجم کی ''جدید عربی شاعری ہندوستان میں عربی ادب کے تنقیدی رجحانات اور جدید شعراء کے افکار وخیالات کی عملی تنقید کا مظہر ہیں، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی کتاب الادب العربی بین عرض ونقد بھی ہندوستان میں لکھی گئی کتابوں میں خاصی

اہمیت کی حامل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عربی شاعری میں جو تنقیدی رجحانات اور جو اصول تنقید پائے جاتے ہیں، ان کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ مختلف زبانوں کے تنقیدی افکار وآرا سے عربی تنقید نے بھرپور استفادہ کیا ہے اور یہ ارتقا کی بلندی پر پہونچ گئی ہے۔

ایک مسئلہ عربی میں تنقید کی تدریس کا رہ جاتا ہے، اس معاملہ میں سب سے پہلے ضروری ہے کہ طلبہ میں ادبی ذوق اور شعر سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جائے، اشعار کی خواندگی درست ہوجائے، تو معنی کی تفہیم آسان ہوتی ہے، بلکہ بعض دفعہ صرف خواندگی کی درستگی سے کلام کے عیوب کھل کر سامنے آجاتے ہیں، نابغہ کے اشعار جس میں اقواء کا عیب در آیا تھا، ایک لڑکی نے اسے اس طرح پڑھ دیا کہ نابغہ فوری اس عیب کی طرف متوجہ ہوگیا، ہمارے یہاں بہت سارے داخلی وخارجی وجوہات کی وجہ سے ذوق ہی نہیں بن پاتا، جب ذوق بن جائے تو عربی تنقید کے مختلف مکاتب فکر سے طلبہ کو واقفیت بہم پہونچائی جائے اور نقادان فن کی خصوصیات اور ہر مکتب فکر کے مابہ الامتیاز وجوہ واسباب کی معلومات بہم پہونچائی جائے۔

یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تنقید کے مدارج اور اس کی عہد بعہد ترقی کے علم کے بغیر عربی زبان وادب سے واقفیت مکمل طور پر نہیں ہوسکتی، طلبہ جب ان مراحل سے گذر جائیں تو انہیں مختلف قسم کے ادبی شہہ پاروں کے نقد کی عملی مشق بھی کرانی چاہیے اور ان اصولوں اور قواعد سے بھی واقفیت بہم پہونچانی چاہیے جن پر قدیم وجدید عربی تنقید کی بنیاد ہے۔ تنقیدی بصیرت طلبہ میں کس درجہ پیدا ہوئی، اس کے لیے معروف عرب شعراء کے کلام کا موازنہ ان سے کروایا جائے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح کی شکل میں وجہ ترجیح پر بھی زور دیا جائے، جب طلبہ محاسن شعری کا ادراک کرکے اشعار کو عملی تنقید کی سان پر چڑھا سکیں تو سمجھنا چاہیے کہ اب ان کے اندر تنقیدی شعور پیدا ہوگیا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا ادبی رویہ

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں (ولادت: ۱۳/ستمبر ۱۹۵۳ء) نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شعر و شاعری سے کیا، جمیل سلطان پوری سے شعر گوئی کے رموز سیکھے، چند غزلیں اور سہرے شائع بھی ہوئے، لیکن جلد ہی وہ اس دنیا سے نکل آئے، شاید انہیں احساس ہو گیا کہ شاعری محض تخیل ہے، اس سے عام طور پر گرمیٔ محفل، وقتی جوش اور واہ واہ کے علاوہ زیادہ کچھ حاصل نہیں ہوتا، اس احساس کے پیش نظر، انہوں نے ادب کے وسیع کینوس تنقید و تحقیق کو اختیار کیا، اور قلم کی جولانی دکھانے لگے، اور پھر دیکھتے دیکھتے رسائل و جرائد، سیمینار، سمپوزیم اور ریڈیو نشریات کے ذریعہ علم و ادب کی دنیا کے گل سرسبد بن گئے، ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو میں مرصع نثر کی روایت'' پر ہے، جو اب تک شائع نہیں ہوسکا؛ لیکن ان کے مقالے (جن کی تعداد مجھے معلوم نہیں)، اخبارات و رسائل میں شائع ہو کر اہل علم و ادب سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں، خراج تحسین ادا کرنے والوں میں بزرگ شعراء و ادبا بھی ہیں اور ان کے معاصرین بھی، حالانکہ معاصرت حجاب اکبر ہے اور اس معاملہ میں بخل کبھی معیوب نہیں سمجھا گیا ہے، اس سلسلہ میں اعتراف و اقرار کی روایت اس وقت تک نہیں رہی ہے، جب تک کسی کے فن کا جادو سر چڑھ کر نہ بولنے لگے، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں اس اعتبار سے خوش نصیب ہیں کہ ان کی تنقید اور ادبی رویہ کا سورج ابھی سے سوا نیزے پر ہے، جس کی روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہیں اور دل و دماغ مسحور ہو رہے ہیں جب کہ انہوں نے اپنی زندگی کے ساٹھ سال بھی پورے نہیں کیے ہیں، جب آدمی خود کو ریٹائر سمجھنے لگتا ہے یا محکمہ بالجبر سبکدوش کر دیتا ہے، ایسے میں ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ وہ ادب و تنقید، لسانیات و اسلوبیات کے میدان میں اپنی قلم کی جولانی مزید دکھاتے رہیں گے اور علم و ادب کے تشنگان، ان کے علوم و معارف سے اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے۔

اس تمہیدی گفتگو اور نیک خواہشات کے ساتھ ہمیں یہ جاننا ضروری ہے کہ ادبی تحقیق و تنقید

میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا اپنا ادبی رویہ کیا ہے؟ اسے جاننے کے لیے ہمیں ان کی شخصیت کی تشکیل کے خارجی عوامل کو جاننا چاہیے، شعور سنبھالنے کے بعد ہی سے اسلامی تحریکوں سے ان کی وابستگی رہی ہے، وہ اسٹوڈنٹس اسلامک آرگنائزیشن (ایس آئی او) کے عرصہ دراز تک ممبر اور اس کے ترجمان رفیق پٹنہ کی مجلس ادارت کے رکن رہے، اس طرح ان کا ذہنی اپروچ اور ادبی رویہ اسلامی فکر و نظر سے سیراب ہوتا رہا، ادارہ ادب اسلامی سے وابستگی نے اس رویہ کو مزید جلا بخشی، اور ان کا رویہ تنقید نگاری میں منفی سے زیادہ مثبت ہو گیا، انہوں نے ادب و تنقید میں بھی ایسے الفاظ کے استعمال سے گریز کیا، جس سے کسی کی تضحیک کا پہلو نکلتا ہو؛ بلکہ انہوں نے ان موضوعات کو سرے سے اپنی نگارشات کا موضوع نہیں بنایا، جس سے کسی کی دل آزاری کا امکان ہو، مجھے خوب یاد ہے کہ اسّی پور ویشالی کے اقبال سیمینار میں جب میں نے اقبال کی سہ بیتی ''حسین احمد'' کا تنقیدی جائزہ'' پیش کیا تو انہیں بالکل پسند نہیں آیا؛ حالانکہ ایک بڑے طبقے نے اس تحقیق پر مجھے مبارک باد دی اور پسندیدگی کے خطوط لکھے، اسی طرح جب میں نے اپنے ایک مضمون میں اسلامی شعرا کے ساتھ ترقی پسند شعراء کا موازنہ کیا تو انہوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، کیونکہ اس سے ایک طبقہ کی دل آزاری کا امکان تھا، جب کہ میری سوچ ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ دل آزاری بری چیز ہے؛ لیکن کھرے کھوٹے کی پرکھ کے لیے کئی دفعہ اسے نظر انداز کرنا پڑتا ہے اور بلاخوف لومۃ لائم قلم اٹھانا پڑتا ہے۔

اسلامی تنظیموں اور اسلامی فکر کے مراکز سے وابستگی کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ ان کے اندر صالح بنیادوں پر اثر پزیری کی صلاحیت پیدا ہوئی؛ جس سے ان کی شخصیت کو تو فائدہ پہنچا ہی ان کے ادبی رویہ میں اس کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک زمانہ تک پروفیسر کلیم الدین احمد کے ساتھ اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے کام کیا، اپنے تحقیقی مقالہ کا نگراں انہیں بنایا، اور ان سے کسب فیض کیا؛ لیکن ادبی تحقیق و تنقید میں ان کی انتہا پسندی سے کچھ نہیں لیا بلکہ ادبی رویہ میں اعتدال اور توازن کو اپنایا، کیونکہ یہی اسلامی تعلیم کے مطابق ہے اور یہی فکر سلیم ہے۔

فکر سلیم کے خارجی مظاہر کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر خلوص ہو، گو اس کے ناپنے کا پیمانہ آج تک ایجاد نہیں ہوا، کیونکہ یہ پورا معاملہ انسان کے ''درون'' سے متعلق ہے اور اس کا حال ''علیم

بذات الصدور'' ہی جان سکتا ہے؛ لیکن ڈاکٹر صاحب جس طرح لوگوں سے ملتے ہیں، شاگردوں پر شفقت کرتے ہیں، چھوٹوں کو آگے بڑھانے کی سوچتے رہتے ہیں، اس سے ان کے اندر کا خلوص جھلکتا نہیں چھلکتا ہے، یہ خلوص ڈاکٹر صاحب کی تنقیدوں اور دوسری تحریروں میں بھی نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی نگارشات قاری کو پڑھنے پر اکساتی نہیں، مجبور کرتی ہیں، قاری جب انہیں پڑھنا شروع کرتا ہے تو ان کی سحر آفریں نثر میں بندھ جاتا ہے اور یہ کیفیت مضمون کے مکمل پڑھنے کے بعد ہی ختم ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے ادبی رویہ میں اس بات کو بڑی اہمیت حاصل ہے کہ سب کچھ بھلائی اور خیر کے لیے ہو اور بقول ڈاکٹر صاحب ''اپنے مقصد ومنہاج کے اعتبار سے یہ سب انسانی زندگی کو زیادہ مالا مال، زیادہ حسین اور زیادہ بابرکت بنانے کے لیے ہیں'' ظاہر ہے اس رویہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ایسے فن پارے جن سے زندگی میں خیر نہ پیدا ہو اور جو رذائل سے انسانی اخلاق واقدار کو پاک نہ کر سکے، اس کی کوئی قدر وقیمت علم وادب کے میزان میں نہیں ہے، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے تو نہیں؛ لیکن اکبرالہ آبادی نے اسی بات کو اپنے انداز میں کہا ہے۔

ہم ایسی سب کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
جنہیں پڑھ کر بچے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ڈاکٹر اقبال نے ''جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی'' کہہ کر دین سے سیاست کو جدا کرنے کی مخالفت کی تھی، ڈاکٹر صاحب اسی حوالہ سے دین وادب کے رشتے کا لزوم بتاتے ہیں؛ کیونکہ زندگی کو صالح رخ دینے اور اسے صحیح سمت سے آشنا کرنے کے لیے دین سے وابستگی ضروری ہے، ان کے نزدیک ''زندگی سے متعلق بنیادی اور اہم سوالات کو نظر انداز کر کے ادب کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی صالح حیات بخش زندگی اور اعلی ادب کی تخلیق ممکن ہے۔''

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی اور شریعت سے مربوط ہونے کی وجہ سے علماء کرام کے وعظ اور بینے کے روزنامچے کو بھی ادب کے زمرے میں شامل کر لیا جائے، یقیناً ان کی ہماری زندگی میں بڑی اہمیت ہے اور یہ انسانی اعمال کو خیر کی طرف راغب اور متوجہ کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہیں، اس

سے زندگی سنورتی ہے، بینے کے روزنامچے معاشی جدوجہد کی داستان سناتے ہیں؛ لیکن ہم اس کو ادب نہیں کہہ سکتے۔ ادب کے لیے خیر کی طرف رغبت اور شر سے تنفر کے علاوہ بھی بہت کچھ ضروری ہے، ادب میں کیا کہا؟ اور کس طرح کہا؟ دونوں کی اہمیت ہے، یقیناً کیا کہا؟ زیادہ اہم ہے؛ لیکن اس کو ادبی فن پارے بنانے کے لیے کیسے کہا؟ کا مطالعہ بھی ضروری ہے، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے بقول ''ادب بننے کے لیے لازم ہے کہ کوئی تحریر ادب کا رنگ وروپ اور بوباس اختیار کرے، اس لیے بقول ڈاکٹر صاحب: ''کسی ادب پارے یا فنی تخلیق پر مکمل سیر حاصل اور کما حقہ گفتگو اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کی ہیئت واسلوب کے ساتھ مواد ومضامین کو زیر مطالعہ یا زیر بحث نہ لایا جائے۔''

ڈاکٹر صاحب کے اس اقتباس میں ہیئت واسلوب سے زیادہ مواد ومضامین پر توجہ مرکوز کی گئی ہے؛ لیکن خلاصہ یہی قرار پاتا ہے کہ کسی تحریر کو ادبی قرار دینے کے لیے دونوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے ادبی رویہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ ادب وشاعری میں بھی قول وعمل کے تضاد کو برا سمجھتے ہیں ان کے نزدیک ادب وشاعری میں وہی کچھ پیش کرنا چاہیے؛ جو ہمارے ایمان ویقین کا حصہ ہے، ہم اللہ اور رسول پر ایمان رکھیں اور ادب میں ملحدانہ اور کافرانہ نظریات کی ترویج کریں، یہ مغربی تحریکوں سے مرعوبیت کی علامت ہے، ایسے لوگوں کو گمراہ ثابت کرنے کے بجائے، انہیں ان کی نظریاتی اور اعتقادی تضاد سے باخبر کرنے کی ضرورت ہے، ڈاکٹر صاحب کی یہ فکر بہت اچھی ہے کہ یہ کام حکمت، دل سوزی اور خیر خواہی کے جذبہ سے کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے ادبی رویہ میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قدیم وجدید کی بنیاد پر ادب کو اعلی وارفع قرار دینا صحیح نہیں ہے، قدیم ادب میں بھی غیر اخلاقی مضامین، بوس وکنار کے مناظر، عشق ومحبت کی گھٹیا داستانیں بڑی مقدار میں موجود ہیں، اسی طرح جدید ادب میں بھی سب کچھ صحیح نہیں ہے، دیکھنا یہ نہیں چاہیے کہ یہ شاعری کب کی ہے؟ کس دور کی ہے؟ دیکھنا یہ ہے کہ اس میں خیر کا عنصر کتنا ہے اور شر کا عنصر کس قدر، اگر خیر غالب ہے اور اسلوب وہیئت کے اعتبار سے بھی وہ ٹھیک ٹھاک ہے تو ہم اسے اعلی ادب قرار دے سکتے ہیں، اس کے بالمقابل اگر شر غالب ہے اور وہ شہوانی خواہشات کو برانگیخت کرتے ہیں اور قاری جنسی بے راہ روی کی طرف بڑھتا ہے تو بقول ڈاکٹر صاحب: ''صرف

زبان کی چمک دمک، اسلوب کا بانکپن اور تجربے کی جدتیں کسی ادب پارے کو بزرگ وبرگزیدہ نہیں بناسکتیں۔''

مختصر یہ کہ ڈاکٹر صاحب کا ادبی رویہ اسلام کے ادبی رجحان کا ترجمان ہے، ہمیں یہاں قرآن کریم کی اس آیت کو یاد رکھنا چاہیے جس میں کہا گیا ہے: ''شاعروں کی بات پر وہی چلیں جو بے راہ ہیں، تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور وہ جو کہتے ہیں کرتے نہیں، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور مظلوم ہونے کی وجہ سے بدلہ لیا (ان کا معاملہ دوسرا ہے) (الشعراء:۲۲۴-۲۲۶)

اللہ کرے ڈاکٹر صاحب کا ادبی رویہ اسی طرح قائم رہے اور وہ اسی طرح اپنے مخصوص انداز میں پرورش لوح وقلم کرتے رہیں، نہ غم دوراں اس میں حائل ہو اور نہ غم جاناں۔

ترجمان القرآن۔ایک مطالعہ

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہمہ جہت، ان کے موضوعات متنوع اور ان کی فکر، اسلامی فکر وآگہی سے مزین تھی، عمر کے مختلف ادوار میں ان پر صحافت وسیاست اس قدر حاوی رہی کہ یہی ان کی شناخت بن گئی، ملی کاز کے لئے جو کارنامے انہوں نے انجام دئے وہ دب سے گئے، یا دھیرے دھیرے نظروں سے اوجھل ہوتے چلے گئے، حزب اللہ کی منصوبہ بندی، ۱۶/جون ۱۹۲۱ء کو امارت شرعیہ کے قیام کے لئے بلائی گئی مجلس کی صدارت، مدرسہ اسلامیہ رانچی کا قیام، قرآن کریم کو نئی نسل کے سامنے موجودہ حالات کے تناظر میں ابلاغ اور الہلال کے ذریعہ پیش کرنا اور اس جیسے بہت دوسرے کام وہ ہیں جو مولانا کی ملی خدمات کا جلی عنوان ہیں، جس پر بہت نہیں لکھا جاسکا ہے، ان پہلوؤں پر مزید لکھنے کی ضرورت ہے تاکہ مولانا کی شخصیت اسلامی مفکر اور مفسر کے طور پر دنیا کے سامنے پورے طور پر آسکے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے ستائیس سال تک قرآن کریم میں غور وفکر کا سلسلہ جاری رکھا، مطبوعہ وغیر مطبوعہ تفاسیر کے بڑے ذخیرے پر نگاہ دوڑائی، انہوں نے ایک ایک سورت اور ایک ایک آیت بلکہ ایک ایک لفظ پر بقول ان کے وادیاں قطع کیں اور مرحلے طے کئے اور بات یہاں تک پہونچ گئی کہ انہوں نے لکھا:

''میرے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں ہے جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں سے نہ گذر چکا ہو''۔

ان مراحل سے گذرنے کے بعد انہوں نے بہت سارے معلمین کی طرح قرآن کریم کی تفسیر لکھنے کا کام شروع کیا، قرآن کریم کو انہوں نے اپنی فکر ونظر کا ایسا محور بنایا کہ ضمیر پر نزول کتاب کی بات صادق آنے لگی پھر انہوں نے تقلیدی انداز میں نہیں، اپنی تحقیق کے مطابق اپنے خاص انداز واسلوب میں قرآن کریم کی تفسیر کی، اس تفسیر میں دیگر تفاسیر کی طرح تفصیلات تو نہیں ملتیں لیکن مولانا آزاد کی صراحت کے مطابق اس میں وہ سب کچھ ہے جو قرآن کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

ترجمان القرآن میں مولانا کے مخاطب عوام الناس ہیں اور انہوں نے فلسفیانہ موشگافیوں اور متفرق علوم وفنون کے مباحث کو پیش کرنے سے قصداً گریز کیا ہے، اس کے باوجود مولانا نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور نکتہ رس نگاہ کی وجہ سے نئے مضامین، علمی نکات اور وسیع معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔

مولانا نے ترجمان القرآن کو دوراز کار دقیقہ سنجیوں، منطق وفلسفہ کے مباحث ومصطلحات سے بوجھل نہیں ہونے دیا، مولانا نے صاف لفظوں میں ان حضرات پر تنقید کی جو قرآن کریم کی سائنسی توجیہہ کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں، مولانا کا خیال تھا کہ سائنسی نظریات وتحقیقات دائمی نہیں ہوتے، وہ بدلتے رہتے ہیں، ایسے میں کسی ایک کی صحت اور اﷲ رب العزت کے فرمان کی جانچ سائنسی توجیہات کے ذریعہ کرنا صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ قرآن کریم کا بیان ابدی ہے اس میں تغیر وتبدل کا امکان نہیں ہے خالق کائنات کا علم ازلی وابدی ہے، اس کے نزدیک ماضی حال اور مستقبل یکساں ہیں، اسی لئے مالک الملک نے جو فرمادیا وہی اصلی ہے اور دوسرے علوم کی تحقیقات تغیر پذیر ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ترجمان القرآن میں مولانا آزاد نے عصری علوم کو پس پشت ڈال دیا ہے؛ بلکہ انہوں نے مختلف واقعات کی تفسیر میں جدید علمی مباحث، علم الآثار، جغرافیہ اور تاریخ سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور جو تحقیقات پیش کی ہیں وہ ان کے قرآنی مطالعہ کی بصیرت کی آئینہ دار ہیں۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ذہانت اور وسیع معلومات کی بنیاد پر لکھی گئی اس تفسیر میں سب کچھ صحیح ہے، کئی جگہ مولانا، نئی تحقیق پیش کرنے اور اپنے علم پر کامل اعتماد کے زعم میں بہت دور نکل گئے ہیں اور غلط فہمی میں پڑ گئے ہیں، مثال کے طور پر "وَلِسُلَیْمَانَ الرِّیْحَ عَاصِفَةً تَجْرِی بِاَمْرِهٖ اِلَی الْاَرْضِ الَّتِیْ بَارَکْنَا فِیْهَا" میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے سمندر کے بادتند مسخر کرنے کا مطلب یہ لکھا ہے کہ؛ بادبانی کے بڑے بڑے جہاز چلنے لگے تھے اور خشکی کے جانوروں کی طرح سمندر کی ہوائیں بھی ان کے لئے باربرداری اور نقل وحرکت کا ذریعہ ہوگئی تھیں۔

یہ توجیہہ مولانا نے صرف اس آیت کو عقلی کسوٹی پر اتارنے اور نئی نسل کے اذہان کو مطمئن کرنے کے لئے اختیار کیا ہے، جو قطعاً صحیح نہیں ہیں۔ ترجمان القرآن میں ایسی مثالیں نایاب نہیں ہیں۔

ترجمان القرآن میں حوالوں کی کمی بھی کھٹکتی ہے ۔ مولانا نے جو نکات اٹھائے ہیں اور

جو معلومات فراہم کی ہیں وہ بہت جگہوں پر اپنے پیش رو مفسرین سے ہو بہو لئے ہیں؛ لیکن اس کا حوالہ نہیں دیتے، قاری سر دھنتا ہے کہ مولانا نے کیسا نکتہ نکالا ہے۔

مولانا اپنی سیاسی مصروفیات اور انگریزی عہد میں برسوں جیل میں رہنے کی وجہ سے اسے مکمل نہ کرسکے جو کچھ لکھا وہ بھی بار بار انگریزوں کے نذر ہوتا رہا اور ایک بار کئے ہوئے کام کے ضائع ہونے کے بعد دوبارہ اس کو کرنا بہت مشکل اور گراں ہوتا ہے، طبیعت آمادہ نہیں ہوتی، اسی لئے جن سورتوں کی تفسیر پہلی بار کی لکھی ہوئی ہے وہ نسبتاً تفصیلی ہے اور جس کو انہوں نے دوبارہ لکھا وہ مختصر حواشی کی شکل میں ہے۔

مولانا آزاد کی زندگی میں ترجمان القرآن کی دو جلدیں منظر عام پر آچکی تھی، ۱۹۶۴ء میں سورہ فاتحہ سے سورہ نور تک کی تفسیر چار جلدوں میں ساہتیہ اکیڈمی دہلی نے شائع کیا۔ ۱۹۷۶ء اور ۱۹۸۰ میں تیسرا ایڈیشن اسی اکیڈمی کی طرف سے منظر عام پر آیا۔ مولانا غلام رسول مہر نے الہلال، البلاغ اور دیگر تحریروں کی مدد سے باقیات ترجمان القرآن کے نام سے ایک اور جلد منظر عام پر لانے کا گراں قدر کام کیا، باقی ماندہ سورتوں کی تفسیر میں سورہ تین اور سورہ قدر کی تفسیر مولانا کی لکھی ہوئی مل گئی، اس کے علاوہ جو تفسیر ترجمان القرآن میں شامل ہے وہ مولانا محمد عبدہ کی ہے۔ اگرچہ انہوں نے اس کے مرتب کرنے میں مولانا آزاد کی مختلف تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔ یہ حصہ ۱۹۸۲ء میں اسلامی اکیڈمی لاہور نے شائع کیا، ابو مسعود اظہر ندوی نے ترجمان القرآن کی تلخیص کی، جہاں کمی محسوس ہوئی اس کی تکمیل میں تفسیر ابن کثیر اور ترجمہ شیخ الہند سے استفادہ کیا، اگر اس کے ساتھ ترجمان القرآن کے حوالوں کی تخریج کا کام بھی ہو جاتا ہے تو اس کی علمی افادیت اور بڑھ جاتی۔

فتاویٰ علماء ہند ـــــ ایک اجمالی تعارف

عصر حاضر میں علمی دنیا میں جوانقلاب آیا ہے اورکم وقت،کم محنت میں زیادہ معلومات کے حصول کی جوخواہش پیدا ہوئی ہے اورجدید ذرائع معلومات نے جس طرح پورے علمی ذخیرے کوایک سی ڈی(C.D)اورایک سائٹ(Web Site)میں بندکردیا ہے،وہ اس دور کی بڑی حصولیابیوں میں سے ایک ہے،انہیں خواہشات نے علمی دنیا میں انسائیکلوپیڈیا(Encyclopedia)، موسوعات اورقاموس کےفن کووجود بخشا،الگ الگ موضوعات پرمرتب ان کتابوں کی وجہ سے علمی،تحقیقی،تصنیفی،بلکہ تدریسی کام بھی پہلے کی بہ نسبت آسان ہوگیا ہےاوراب کم وقت،کم محنت اورکم سرمایہ میں ہم اپنے ذوق کی تسکین کرسکتے ہیں اورمعلومات کاذخیرہ اکٹھا ہوسکتا ہے۔

یہ تمہید ہم نے یہ بتانے کے لیے قائم کی ہے کہ ابھی حال ہی میں نامور عالم دین،فقہی بصیرت کے امین،نکتہ داں،نکتہ رس اورنکتہ بیں،شارح دین مبین حضرت مولانا مفتی انیس الرحمٰن قاسمی،ناظم امارت شرعیہ بہار،اڑیسہ وجھارکھنڈ،چیرمین بہاراسٹیٹ حج کمیٹی کی کتاب ''فتاویٰ علماء ہند-جلداول'' زیورطبع سے آراستہ ہوکرآئی ہے،پانچ سوبہترصفحات پرمشتمل اس پہلی جلد میں چھ سواکیس عنوانات زیربحث آئے ہیں،جن میں تین سوچودہ عنوانات مقدمے کے ہیں،یہ مسائل جن معتبر کتابوں سے لیے گئے ہیں ان کی تعداد ایک سوچون ہے،قرآن وتفسیر،حدیث واصول حدیث،کتب فقہ واصول فقہ،تصوف،رجال وتاریخ اورلغت کی ایک سوچون کتابوں کاعطرکشید کرنا معمولی کام نہیں ہے،اس کے علاوہ اکتالیس معتمد مجموعہ فتاویٰ کاانتخاب ،مکررات کوحذف کرنااورسولہ کتب فتاویٰ کومکمل متن بناکران کوخاص انداز میں ترتیب،تحقیق،تعلیق کے مراحل سے گذارنا،ضروری حواشی سے مزین کرنا،پھران مسائل کے مستدلات کے لیےنص شرعی کی تلاش اورمنصوص مسائل میں بلاواسطہ قرآنی آیات واحادیث کاذکر یہ کام نہیں،کارنامہ ہے اورمیراخیال یہ ہے کہ مولانا انیس الرحمٰن قاسمی اس باب میں خصوصیت سے موفق

ومؤید من اللہ ہیں اورتنہا یہ ایک کتاب مرتب کوعلمی دنیا میں حیات جاودانی بخشنے کے لیے کافی ہے،کتاب کے ناشر منظمۃ السلام العالمیۃ ممبئی کے سرپرست مشہورداعی الی اللہ جناب انجنیر شمیم احمد صاحب کاصداقت پرمبنی یہ جملہ مجھے بھا گیا کہ'' کام کوئی کرتا نہیں ہے مالک حقیقی لے لیتا ہے''،مرتب کتاب کے لیے یہ مقام شکر ہے کہ اللہ یہ کام ان سے لے رہا ہے۔

عادت اللہ یہ ہے کہ جب اللہ کسی سے کام لینا چاہتا ہے تورجال کاربھی اس کوعطا کردیتا ہے،وسائل بھی فراہم کرتا ہے،اتنے بڑے پروجیکٹ کے لیے جس کی صرف طباعت کاصرفہ کروڑوں میں جائے گا،اللہ نے مولانا محمد اسامہ شمیم ندوی ازہری کوکھڑا کردیا،ترتیب میں تعاون کے لیے امارت شرعیہ کی برکت سے مفتی امتیاز احمد قاسمی،مفتی محمد رضاء اللہ قاسمی مل گئے،نظرثانی کے لیے امارت شرعیہ کے دومفتیان گرامی قدرمفتی سہیل احمد قاسمی اورمفتی سعید الرحمٰن قاسمی اوردونائب قضاۃ مفتی وصی احمد قاسمی،مفتی انظارعالم قاسمی کی خدمات حاصل ہوگئیں،نظرنہائی کے لیے مشہورفقیہ اورنامورقاضی مولانا محمد قاسم مظفرپوری اورمولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی دامت برکاتہم اپنا وقت فارغ کرسکے،مفتی راشدالعزیزی ندوی،مفتی مجیب الرحمٰن بھاگلپوری،مفتی عبداللہ محی الدین قاسمی،مفتی محمد امام الدین قاسمی،مولانا عتیق اللہ قاسمی،مولانا بدرانیس قاسمی،مولانا فیاض احمد قاسمی اورمولانا عادل فریدی قاسمی نصف درجن سے زائد وہ علماء کرام،مفتیان عظام ہیں جنہوں نے اس کتاب کی تصحیح میں وقت لگایا ہے،ان کے علاوہ فکررسا،قلب سلیم اوردردمنددل کے مالک اوراس پروجیکٹ کے ذمہ دارمولانا محمد اسامہ شمیم ندوی ازہری کے ساتھ عمومی نگرانی کے لیے ممبئی میں مفتیان کرام کی ایک جماعت ہے،جن کے نام اللہ کے یہاں کسی نہ کسی حیثیت سے درج ہوگئے ہوں گے،البتہ کالی روشنائی میں چھپنے سے رہ گئے ہیں،اس طرح مرتب کی اس علمی مجلس کے ارکان بیس سے زائد تک پہونچ جاتے ہیں۔میرے علم میں یہ بات لائی گئی ہے کہ مرتب نے اس مجلس علمی میں دوسری جلد سے مفتی احتکام الحق قاسمی معاون مفتی، مفتی سہیل اختر قاسمی معاون قاضی امارت شرعیہ اورمحمد عتیق الرحمٰن صاحب کااضافہ کیا ہے۔

فتاویٰ علماء ہند کے جلد اول کوکتاب الطہارت کا نام دیا گیا ہے،لیکن واقعہ یہ ہے کہ آدھی سے

زیادہ کتاب مقدمہ پر مشتمل ہے، جن میں متداول اور مشہور فتاویٰ کے مجموعے سے استفادہ کیا گیا ہے، اسی ذیل میں فقہ اسلامی، تصوف کی حقیقت، قرآن فہمی کا طریقہ، سنت، اجماع، قیاس، اجتہاد، اتباع، تدوین فقہ، فقہ اسلامی کے ادوار، افتا، استفتا، افتا کی اہمیت اور مفتی کی صفات، فتویٰ کے احکام وآداب، استفتا کے آداب واحکام، ہندوپاک کے علما کی فقہی خدمات، ہندوپاک کے مشہور ومعروف دارالافتا کا تعارف، کتب فتاویٰ اور مشہور مفتیان کرام کے اجمالی اور جامع تذکرے، انتہائی معلوماتی اور قیمتی ہیں، یہ سب مختلف فتاویٰ کے مقدمات سے ماخوذ ہیں اور جامعیت کی پوری شان کے ساتھ شامل کتاب ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جزئیات کی تلاش کے لیے ورق گردانی تو وہ کرے گا جسے احکام شرعی جاننے کی طلب ہوگی، یا وہ مبتلی بہ ہوگا، لیکن جلد اول کے مقدمہ کا یہ حصہ تو عام اہل علم کے لیے بھی خاصے کی چیز اور باعث کشش ہے۔

کتاب کے شروع میں صفحہ:۳، پر سورہ توبہ کی مشہور آیت: "فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ". (سورۃ التوبہ:۱۲۲) مع ترجمہ اور اگلے صفحہ پر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "من تفقه فی دین اللّٰه کفاه اللّٰه همه ورزقه من حیث لایحتسب". (مسند ابی حنیفہ حدیث نمبر:۲۰، کنز العمال، حدیث نمبر:۲۸۸۵۵) مع ترجمہ درج ہے، جس سے دین کی سمجھ کے حصول کی اہمیت (جسے اصطلاح میں فقہ کہتے ہیں) ہمارے سامنے آتی ہے اور قاری کا ذہن اس عظیم اور ضخیم کتاب کے مطالعہ کے لیے اس نقطۂ نظر سے تیار ہوتا ہے۔

فہرست مضامین صفحہ:۵، سے شروع ہوکر صفحہ:۳۲، تک پھیلا ہوا ہے، اچھا ہوتا اگر مقدمے کے مضامین کے نمبرات اور مسائل طہارت کے نمبرات نمبر شمار میں الگ الگ کئے جاتے، کیوں کہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، موضوع کے اعتبار سے بھی اور اصل کے اعتبار سے بھی، فہرست مضامین کے بعد سرپرست منظمۃ السلام کا کلمۃ الشکر ہے جو تواضع، انکسار، اظہار عجز ودرماندگی اور فنائیت کا عمدہ نمونہ ہے، حرف آغاز امیر شریعت مولانا سید نظام الدین، تقریظ مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، پیش لفظ مولانا محمد اسامہ شمیم ندوی ازہری، مقدمہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، تقدیم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، حرف چند حضرت مولانا محمد قاسم مظفر پوری کا ہے، جس میں ان حضرات نے کام کی اہمیت اور طریقہ کار پر روشنی ڈالی ہے، بقول

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی: اس مجموعہ میں جہاں اصحاب فتاویٰ کے علم وتحقیق کی روشنی جلوہ فگن ہے، وہیں مرتب کی دیدہ وری، حسن انتخاب، وسیع النظری اور خوش مذاقی کے نقوش بھی ثبت ہیں، بقول مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی: "یہ کتاب حنفی فقہ کے فتاویٰ کی ایک موسوعہ کتاب بن گئی ہے، بقول امیر شریعت مولانا سید نظام الدین صاحب: مولانا نے اس ذمہ داری کو پوری فقہی بصیرت اور خداداد صلاحیت کے ساتھ نبھایا ہے، بقول مفتی محمد تقی عثمانی صاحب: انشاء اللہ یہ مجموعہ نافع ہوگا، بقول حضرت مولانا محمد قاسم مظفر پوری: جس کی تکمیل کے بعد فتاویٰ کی دنیا میں یقیناً ایک علمی انفجار نظر آئے گا

جس سے ہر صاحب ذوق متأثر ہوکر رہے گا۔ عام طور سے کتاب میں ایک ہی مقدمہ ہوا کرتا ہے، اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دو مقدمے ہیں، ایک مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا اور دوسرا خود مرتب کتاب مولانا مفتی انیس الرحمٰن قاسمی کا، اس دوسرے مقدمہ میں صفحہ ۴۹، سے صفحہ ۵۴، تک ذیلی عناوین کی کمی کھٹکتی ہے، ان صفحات میں بہت سی اصولی اور قیمتی باتیں آگئی ہیں، انہیں صفحات میں ان کتب فتاویٰ کا بھی ذکر ہے جن کے مندرجات شامل کتاب کیے گئے ہیں، لیکن ان پر ذیلی عناوین نہیں ہیں، فہرست مضامین میں، مقدمہ میں "مکمل طور شامل کتب فتاویٰ" کی پہلی سرخی لگائی گئی ہے، جس سے فہرست مضامین دیکھ کر پڑھنے والوں کو ایک خلا محسوس ہوتا ہے۔

طریقۂ ترتیب میں جو خصوصیات ذکر کی گئی ہیں ان میں ہر باب اور فصل کے مسائل آسان اور سہل عناوین کے تحت جمع کرنا، مسائل کے اندراج میں تکرار سے احتراز، ایسے تمام مسائل جن کے سوال وجواب کی نوعیت میں فرق نہیں ہے ان میں سے ایک کو متن میں درج کرکے باقی کتب فتاویٰ کے حوالے کا لفظ "کذا" کے ساتھ اندراج، حاشیہ میں مفتی بہ مسائل کا اضافہ، مسائل منصوصہ میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے حوالے اور مجتہد فیہ مسائل میں معتبر فقہی کتابوں کی عبارت کے نقل کرنے کا التزام اور نئے مسائل کے ذکر کا اہتمام کیا گیا ہے، انداز تحریر صاف اور سلیس اختیار کیا گیا ہے تاکہ کم پڑھا لکھا بھی اسے پورے طور پر سمجھ لے، البتہ طریقۂ ترتیب کی خصوصیات بتانے کے لیے جو نمبرات لگائے گئے ہیں وہ خصوصیات سے زیادہ پیراگراف کی شمولیت کے نمبرات بن گئے ہیں، غور سے دیکھیں تو یہ خصوصیات زیادہ سے زیادہ نو نمبروں تک سما جائیں گے، جب کہ تیرہ نمبر تک مختلف پیراگراف پر نمبر لگائے گئے ہیں۔

مجموعی طور پر یہ کتاب انتہائی علمی، مفید اور اس لائق ہے کہ ہر کتب خانے کی زینت بنے، اس کی موجودگی سے متداول فتاویٰ کی کتابوں سے ہم بے نیاز ہوں گے اور بہت ساری جزئیات صرف ایک مجموعے کے ہاتھ میں ہونے سے حل ہو جائیں گی، محقق علما کے لیے کتاب کا حاشیہ بہت قیمتی ہے اور بڑی محنت سے اسے مرتب کیا گیا ہے۔

البتہ مسائل کے استخراج میں حدیث پر مزید توجہ کی ضرورت ہے، بہت سارے ایسے مسائل جن میں احادیث ذکر کئے جاسکتے تھے ان میں احادیث درج ہونے سے رہ گئی ہیں جیسے خروج مذی کا ناقض ہونا وغیرہ، دوسری جلد میں اس کے اہتمام پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، کیوں کہ یہ بھی اس مجموعہ کی خصوصیات میں سے ایک ہے، پروف کا کام محنت سے کیا گیا ہے، لیکن اغلاط پھر بھی رہ گئے ہیں، فہرست سازی مقصود نہیں، بتانا صرف یہ ہے کہ اس پہلو پر بھی مزید توجہ دینی چاہیے مثلاً! الاشباہ والنظائر کے حوالہ سے ''الیقین الیزول بالشک'' یقینی طور پر ''لایزول'' ہے، اس قسم کی مثالیں کم یاب ضرور ہیں، نایاب نہیں ہیں۔ کتاب کے آخر میں مأخذ و مصادر کے طور پر ان کتابوں کی تفصیلات مذکور ہیں جن سے اصل فتاوے اور حواشی میں کام لیا گیا ہے، کیا ہی اچھا ہوتا اگر آیات و احادیث کا اشاریہ بھی دیا جاتا جو حوالے کے طور پر درج کئے گئے ہیں، یہ اشاریہ ہر باب کے ذکر کے ساتھ درج کیا جائے تو قاری کے لیے ان حوالوں کو مستحضر رکھنا آسان ہو جائے گا اور کتاب کی افادیت بڑھ جائے گی، ایک اشاریہ اعداد و شمار کے ساتھ مختلف فتاویٰ سے اخذ کردہ مسائل کا بھی بنایا جاسکتا ہے، اس سے کسی خاص مفتی کے فتویٰ کے جاننے میں سہولت ہو جائے گی اور قاری کو اگر صرف اس خاص عالم کے فتویٰ کی تلاش ہوگی تو کم وقت میں مطلوب تک پہونچ جائے گا اور یہ موسوعات اور قاموس کے فن کے عین مطابق ہوگا۔

میں نے مجموعہ میں شامل کتب فتاویٰ اور مفتیان کرام کی خصوصیات کے ذکر سے قصداً اجتناب کیا ہے کیوں کہ یہ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی، ہمارے اکابر نے ہمیشہ احتیاط، اعتدال، توازن اور مسائل کی تحقیق کے ساتھ جواب لکھنے کا اہتمام کیا ہے، عوام کی طرف سے آنے والے استفتا کے جوابات مختصر لکھنے کا مزاج رہا ہے، لیکن جب اہل علم کی طرف سے سوال کے آنے کا ادراک ہوا تو ایک ایک سوال پر پورا رسالہ وجود میں آ گیا، اس وقت ان حضرات کی فقہی بصیرت اور تحقیق کا کمال سامنے آتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

علم کے سمندر میں طغیانی آ گئی ہے اور موج در موج حقائق و معارف ساحل سمندر چلے آرہے ہیں، معمول یہ بھی رہا ہے کہ اگر اپنے فتویٰ کے خلاف حق واضح ہو گیا تو فوراً رجوع کر لیا، ایسی بے نفسی دوسی جگہ کم دیکھنے میں آتی ہے۔

کتاب کی طباعت عمدہ، کاغذ قیمتی اور جلد ریگزین کی بنی ہے، جلد سازی بہتر اور مضبوط ہے، ان تمام خصوصیات کے ساتھ پانچ سو بہتر صفحات کی قیمت ساڑھے پانچ سو روپے زائد نہیں ہیں، یعنی ایک روپے صفحہ سے بھی کم، کتب فروشوں کو دیا جانے والا کمیشن ذہن میں رکھیے تو ''نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز'' کا مصداق سمجھ میں آئے گا۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کی ساری جلدیں مکمل کرادے، کتاب کے نام فتاویٰ علماء ہند میں ''ہند'' سے مراد غیر منقسم ہندوستان کے حنفی علما ہیں، کیوں کہ اس میں پاکستانی علما احناف کے فتاوے بھی شامل ہیں، احناف میں بھی دوسرے مکتب فکر کے فتاوے کی شمولیت سے قصداً گریز کیا گیا ہے تاکہ عام قاری ذہنی انتشار سے محفوظ رہ سکے، غیر منقسم ہندوستان کی بات سرحدوں کے بٹنے کے بعد نہ سمجھ میں آئے تو ''تسمیۃ الکل باسم الجز'' کی اصطلاح کو سامنے رکھیے، اپنے علم میں اضافہ کیجئے، شریعت پر عمل کے لیے ہر وقت تیار رہیے اور مرتب کتاب اور ان کے رفقاء کے لیے صحت و عافیت کے ساتھ درازیٔ عمر اور اس کتاب کی سبھی جلدوں کے مکمل ہونے کی دعا کیجئے۔(())

''اقبال۔شاعرودانشور''--ایک مطالعہ

علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت، دانشورانہ رفعت، افکار کی ندرت، اسلوب کی انفرادیت، اوران کے قلب تپاں میں ملت کی الفت اور درد کی وسعت سے کوئی انکار کی جرأت نہیں کرسکتا، وہ بھی جو اقبال کے فکروفن کومدح وقدح کی روشنی میں تنقید کی سان پر چڑھاتے رہے ہیں اور وہ بھی جوان کے سخن فہم کم اور طرف دار زیادہ رہے ہیں۔

اسی لیے اقبالیات پر بہت کتابیں لکھی گئیں بعضوں نے اپنی زندگی اقبال کے مطالعہ، تجزیہ ان کے افکار کی تشریح اورفن کے محاسن کی ترویج پرصرف کردی اور ہمارے کتب خانوں میں کمیت اور تحقیق میں کیفیت کے اعتبار سے قابل قدر اضافہ ہوا اور ہوتا رہتا ہے۔

اس تمہید کا مقصد قارئین کو''اقبال، شاعر اور دانشور'' نامی نئی کتاب سے متعارف کرانا ہے جو مشہور ادیب نامور نقاد، بافیض استاد، اورعصر حاضر میں اردوتحریک کے نامور قائد ڈاکٹر ممتاز احمد خان ریڈر شعبۂ اردو بہار یونیورسٹی کی تازہ ترین تصنیف ہے، دوسونوے صفحات پرمشتمل یہ کتاب ابھی ۲۰۱۳ء میں گلوریڈس پبلیسرز، ابوالفضل انکلیوئی دہلی ۲۵ سے طبع ہوکرمنظر عام پرآئی ہے، طباعت دیدہ زیب اور گٹ اپ، سٹ اپ بھی عمدہ ہے، جلد سازی بھی اچھی ہے اور قیمت بھی باٹا کے انداز میں تین سو ننانوے روپے ہے، مہنگائی کے اس دور میں اتنی خوبصورت کتاب کے لئے یہ زیادہ نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ اردو کے قارئین مہنگائی کی مار سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ زمانہ کے اعتبار سے کم قیمت بھی گرانی کے احساس سے انہیں دوچار کردیتی ہے، اور ایسے موقعوں سے وہ بغلیں نہیں جیبیں جھانکنے لگتے ہیں، اوراردو پبلیشر کوقارئین کی گم کشدگی کا احساس ستانے لگتا ہے۔

کتاب کے مندرجات میں اقبال کی سوانح حیات اورشخصیت پرپیش لفظ کے بعد ایک طویل مقالہ ہے، اس سے فراغت کے بعد فکروفن کا مطالعہ کیا گیا ہے، جس کے ذیل میں نظم نگاری، غزل گوئی، نظریۂ خودی، نظریۂ فن، تصوف، جمہوریت، اشتراکیت، فکری سرچشمے، منظری شاعری، حب الوطنی

نوجوانوں کے نام پیغام اورشاہین کی علامت پر بحث کی گئی ہے، کتاب کا ایک بڑا حصہ منتخب نظموں کے تجزیاتی مطالعہ پرمشتمل ہے، انسان، ایک شام، شکوہ، جواب شکوہ، خضرراہ، طلوع اسلام، مسجد قرطبہ، ذوق وشوق، ساقی نامہ، لینن خدا کے حضور میں، دین وسیاست، شاہین، ابوالعلامعری، چیونٹی اورعقاب، ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام، شعاع امید جیسی معرکتہ الآرا اور داخل نصاب نظموں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

اقبال کی فارسی شاعری، نثر نگاری، اقبال کی عالمی شہرت ومقبولیت جیسے عنوانات بھی زیرقلم آئے ہیں۔اقبال پر اردو وانگریزی میں لکھی گئی منتخب کتابوں کی فہرست بھی دی گئی ہے اور حیات اقبال ماہ وسال کے آئینے میں جاکر یہ کتاب اختتام کوپہونچتی ہے۔

پیش لفظ میں مصنف نے مطالعۂ اقبال سے اپنی دلچسپی اوروابستگی کے ساتھ ان کاموں کا ذکر کیا ہے، جو اقبال کے حوالہ سے انہوں نے انجمن ترقی اردو ویشالی کے زیراہتمام کیا، اورجس میں ان کے رفقاء گرامی قدر جناب انوارالحسن وسطوی، ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق، مصباح الدین احمد، ظہیر نوری وغیرہ نے اہم رول ادا کیا تھا، احقر محمد ثناءالہدیٰ قاسمی بھی گرد کارواں کے طور پر دوش بدوش تونہیں پیچھے پیچھے چل رہا تھا، اس تحریک نے جواثرات چھوڑے اس کی تفصیل جناب انوارالحسن وسطوی کی کتاب ''انجمن ترقی اردو ویشالی کی خدمات میں دیکھی جاسکتی ہے، جسے الہدیٰ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ نے عمدہ انداز میں چھاپا ہے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان صاحب نے اس کتاب میں ان کتابوں کا بھی ذکر کیا ہے، جوان کے مطالعہ میں ہیں اوررہی ہیں، انہوں نے اپنے چالیس سالہ مطالعہ تدریس اورغوروفکر کے بعد یہ کتاب لکھی ہے اورطلبہ کی ضرورت کوسامنے رکھ کر ان کی علمی سطح کوملحوظ رکھتے ہوئے لکھی ہے۔انہوں نے دل کھول کر ان بزرگوں اوراحباب کا بھی ذکر کیا ہے، جن کی تحریک اورتعاون سے یہ کتاب تیار ہوسکی، پیش لفظ کے مطالعہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب چھپنے کے پہلے ہی بہار یونیوسٹی میں داخل نصاب ہوگئی تھی۔

پیش لفظ کے مطالعہ سے فراغت کے بعد اقبال کی سوانح حیات اور شخصیت میں ہم کھوجاتے ہیں۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے صفحہ ۱۵ سے ۸۷ تک اقبال کی حیات کے ساتھ ان عناصر، عوامل اور

واقعات کا جامع انتخاب پیش کیا ہے، جس سے اقبال کی شخصیت کی تشکیل ہوئی، ان اساتذہ اور انجمنوں کا بھی ذکر کیا ہے، جن کی توجہ اور شفقت سے اقبال سے سر اقبال اور علامہ اقبال بن گیے ، اس باب میں تقریباً باسٹھ ذیلی عناوین کے ذریعہ ہم اقبال کی حیات وشخصیت سے واقف ہوتے ہیں ، اور ان کے عادات واطوار اور اخلاق وخصائل کا مرقع ہمارے سامنے آتا ہے ، واقعات کے انتخاب میں رطب ویابس سے احتراز کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک اس پورے باب میں کفر کے فتوے کا ذکر نہیں ہوتا تو بہتر ہوتا، ایک ایسا فتویٰ جس سے نہ ان کی شاعری متاثر ہوئی اور نہ سماجی طور پر اس فتوے کا کچھ اثر ہوا، اور نہ ہی اقبال کی زندگی نے اس کا کچھ اثر قبول کیا، اس کے ذکر کے بغیر بھی یہ سوانحی باب مکمل ہو جاتا ، کیا ضروری ہے کہ ہم ان ناخوش گوار واقعات کا ذکر کریں جو کسی طرح بھی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوئے ؛ لیکن ظاہر ہے واقعات کا انتخاب مصنف قاری کے ذہن کی ترجیحات سے نہیں کر سکتا ، اس کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں، اس لیے یہ واقعہ بھی اس باب میں جگہ پا گیا۔

فکر وفن کے مطالعہ میں ان اسباب کا ذکر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے اقبال نے نظم کی ہیئت کو اپنے افکار کی ترسیل کا ذریعہ بنایا، مصنف کے بقول ''نظم اقبال کے فکر وخیال اور ان کی فنی مزاج سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مربوط ومسلسل اظہار خیال کی زیادہ گنجائش ہے اور اقبال جیسے مفکر شاعر کے فلسفیانہ افکار وخیالات کی متحمل ہے'' مصنف نے اس باب میں اقبال کے نظریات پر بھی تفصیلی بحث کیا ہے ، اور ان کے فکری سرچشمے تک ہماری رہنمائی کی ہے ان کی منظری شاعری اور حب الوطنی اور ان علامتی الفاظ کا بھی ذکر کیا ہے جو اقبال کی شاعری میں رموز وکنایہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں ، اقبال کے فکر وفن کے مطالعہ کے باب میں اگر ان کی ظریفانہ شاعری پر بھی گفتگو ہو جاتی تو یہ باب زیادہ جامع اور مکمل ہوتا، اقبال کی ظریفانہ شاعری بھی خاصے کی چیز ہے، اور اس میں بھی ایک پیغام ہے، لیکن بہت سارے نقاد اسے قابل اعتنا نہیں سمجھتے اور اس کا ذکر بھی نہیں کرتے گویا اقبال نے ظریفانہ شاعری کی ہی نہیں، اس کتاب میں بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔

منتخب نظموں کے تجزیاتی مطالعہ میں ان نظموں کا انتخاب کیا گیا ہے جو نصاب میں داخل رہی ہیں ، اس باب میں طلبہ کی ضروریات کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، اور ڈاکٹر صاحب کلاس روم میں اقبال کو

پڑھانے کے لیے جو نوٹس تیار کرتے رہے اور جس کے ذریعہ طلبہ اقبال سے قریب ہوتے رہے، اسے از سر نو نظر ثانی اور قابل قدر اضافہ کے ساتھ داخل کتاب کر دیا ہے، اس مطالعہ میں عملی تنقید کے اصول کو برتا گیا ہے اور اشعار میں جو افکار ہیں اس کے دروبست پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور فنی رموز کو واشگاف کیا گیا ہے۔

اقبال کی فارسی شاعری پر جو گفتگو کی گئی ہے اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ طلبہ کو اس کی واقفیت بہم پہونچادی جائے کہ اقبال کی فارسی شاعری بھی خاصے کی چیز ہے۔ اقبال کے فارسی کلام کے ساڑھے چھ مجموعے ہیں ، ساڑھے اس لیے کہ ارمغان حجاز میں معاملہ نصف نصف کا ہے، نصف کلام اردو ہے اور نصف فارسی ، فارسی ہندوستان میں ختم ہوتی جا رہی ہے ، اور طلبہ بھی اس کو لینے سے گھبرانے لگے ہیں ، جس کی وجہ سے اقبال کی فارسی شاعری کمیت اور کیفیت دونوں میں ممتاز ہونے کے باوجود کم زیر بحث آتی ہے، اور جب ہم نے فارسی پڑھنا چھوڑ دیا اور سرکاری سطح پر اسے نصاب سے نکال دیا گیا یا اختیاری بنا دیا گیا تو اسے کون پڑھے اور کون سمجھے، ضرورت ہے کہ اقبال کے فارسی کلام پر بھی اسی شرح وبسط سے روشنی ڈالی جائے جیسی ان کے اردو مجموعۂ کلام پر لکھا جا رہا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اقبال کی فارسی شاعری پر بہت تفصیلی تو نہیں لیکن جامع بحث کیا ہے، اقبال کے اردو قارئین اس سے یقیناً مطمئن ہوں گے اور ان کے علم میں خاصہ اضافہ ہوگا۔

اقبال کی نثر نگاری ، ان کے مضامین ومقالات اور ان کی عالمی شہرت ومقبولیت پر بھی ڈاکٹر صاحب نے جامع تبصرہ کیا ہے جسے پڑھ کر ان کے مطالعہ کی وسعت، تجزیہ اور تنقید کی بہترین صلاحیت کا پتہ چلتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں یہ کتاب قابل قدر اضافہ ہے، آسان، سلیس اور رواں نثر کی وجہ سے ہر طبقے کے قارئین اس سے مستفیض ہو سکتے ہیں، کتاب کو حوالوں سے بوجھل بنانے سے گریز کیا گیا ہے، تنقیدی لفظیات اور ساختیات اور تشکیلیات کے قبیل کے الفاظ بھی کتاب میں نہیں ہیں ، جس کا آجکل فیشن سا چل پڑا ہے ، املا کے سلسلے میں مصنف رشید حسن خان کے افکار سے ڈاکٹر صاحب متاثر رہے ہیں، اس لیے کمپوزنگ میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے اور اس کے لیے ڈاکٹر صاحب نے کمپوزر کا شکریہ بھی ادا کیا ہے، اردو املا کے سلسلے میں ڈاکٹر رشید حسن خان

کی جوسفارشات ہیں اس سے بہت ساری جگہوں پر اختلاف کیا جا سکتا ہے؛ لیکن نہ رشید حسن خان کے خلوص پر سوال اٹھایا جا سکتا ہے اور نہ ہی ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے، البتہ لسانیات میں خاندان السنہ کے مقام ومرتبہ اور اس کی اہمیت پر بحث ونظر کے نئے دروازے کھل سکتے ہیں۔ بلکہ اردو املا کی روشنی میں کھلنے چاہیے۔

علامہ شبلی نعمانی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ناممکنات کی فہرست میں سرفہرست کاتب سے غلطیوں کا نہ ہونا ہے، اس کتاب میں بھی کئی جگہ کمپوزر کی غلطیاں پروف ریڈر کی نگاہ سے بچ کر نکل گئی ہیں، فہرست سازی مقصود نہیں، مثال کے طور پر صفحہ ۸۷ پر باصلاحیت کے بجائے قاصلاحیت اور اسی صفحہ پر ''ملت کے بل لوگوں کی'' درج ہے، بل کا متبادل بھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا سے کیا ہو گیا ہے۔

''باتیں میر کارواں کی'' میری نظر میں

ابھی حال میں عزیز گرامی قدر محمد عارف اقبال کی ضخیم کتاب ''باتیں میر کارواں کی'' مخدوم گرامی، رہبر ملت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب (امیر شریعت سادس امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ) کی دینی، علمی، فکری، قومی اور ادبی خدمات پر مشتمل ایک وثیقہ کے طور پر سامنے آئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سوانحی ادب میں یہ ایک قابل ذکر اضافہ ہے اور میرے مطالعہ کی حد تک حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی کی کتاب ''میر کارواں'' اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی کتاب ''حیاتِ مجاہد'' کے بعد کسی عالم دین کی زندگی پر گزشتہ چند سالوں کے اندر یہ بہترین تالیف ہے، اور مؤلف کے ان جملوں کو کہ ''ان کی زندگی سے متعلق یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے، یہ ان کی سوانح نہیں، بلکہ محض چند بکھرے اوراق کو سمیٹ دینے کی ادنیٰ سی کوشش ہے'' ان کی فطری تواضع اور انکساری کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہئے، نوعمر مصنف کے لئے یہ ایک اچھی علامت ہے، ورنہ اس عمر کا جوش مارتا خون، ''تیس مار خاں'' بننے سے نہیں روکتا اور کبر کے جراثیم کب ذہن ودماغ میں سما گیا پتہ ہی نہیں چلتا۔ ۷۹۶ صفحات کی اس کتاب کو جسے کسر مکمل کر کے ۸۰۰ صفحات لکھا گیا ہے، ایفا پبلی کیشن نئی دہلی نے شائع کیا ہے، سرورق دیدہ زیب عمدہ اور آخر صفحہ پر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی تحریر کتاب اور موضوع کتاب کے حوالے سے وقیع ہے، ایفا پبلی کیشن کی یہ وسعت قلبی بھی قابل تعریف ہے کہ طباعت کے وقت اس نے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ نہیں کروا کے اسے مؤلف کے نام ہی محفوظ قرار دیا ہے، تجارتی اداروں میں ایسی دریا دلی ان دنوں مفقود اور محیر العقول ہے۔ اتنی ضخیم کتاب کی قیمت ۵۰۰/روپے کم ہے، جو اردو قارئین کی قوت خرید کو سامنے رکھ کر ہی رکھی گئی ہوگی، کتاب کا نام ''باتیں میر کارواں کی'' ادبی ہے اور ملفوظات اور شخصیت دونوں کو جامع ہے، کتاب مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، فیصل پبلی کیشن جامع مسجد دیوبند، بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ، نوولٹی بکس قلعہ گھاٹ دربھنگہ اور

مؤلف کتاب کے موبائل نمبر 08285682268 سے خریدی جاسکتی ہے، چند ماہ میں کتاب کے دوسرے ایڈیشن کا آجانا کتاب کے مقبول ہونے کی دلیل کہی جاسکتی ہے۔

کتاب پر مقدمہ حضرت مولانا بدرالحسن قاسمی (کویت) نے لکھاہے، ان کے لفظوں میں ''یہ چندسطریں تو چلتے چلتے انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہونے کی کوشش کہی جاسکتی ہے''، لیکن شہیدوں میں شامل ہونے کی یہ کوشش بھی ہمیں حضرت امیر شریعت کی حیات وخدمات کے بعض اہم گوشوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مولانا کی صاف ستھری، سادی اور شستہ زبان بھی اس مقدمہ کی اہمیت میں بہت اضافہ کیا ہے، عرض مؤلف میں مؤلف نے حضرت امیر شریعت سے اپنے تعلقات، نوازشات، کرم فرمائیوں کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے، پہلے ایڈیشن کے بعض مندرجات کو حذف کرنے کے باوجود قلم چلا اور چلتا گیا ہے، ادبی انداز میں کہیں تو ''لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم'' کہا جائے گا، اسی عنوان کے تحت اس کتاب کی ضرورت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اور اکابرین امارت شرعیہ پر سمینار کی ترغیب بھی دلائی گئی ہے، کلمات تشکر میں ۳۸ لوگوں کا ذکر ہے، اگر میری گنتی کمزور نکلی تو بھی تعداد اس سے کم ہو نہیں سکتی کچھ زیادہ ہی ہوگی، اس میں والدین، بھائی بہن، اکابر علماء، اساتذہ، رفقاء گرامی، قدر کالج کے احباب، صحافتی تگ ودو کے ہم راز وہم کار، امارت شرعیہ کے بہت سارے کارکنان حتیٰ کہ باورچی اور چپراسی تک شامل ہیں۔ کتاب کا انتساب امارت شرعیہ کے بزرگوں، والدین اور ان اداروں کے نام کیا ہے جن کی گود میں بیٹھ کر انہیں پڑھنے، لکھنے اور بولنے کا شعور آیا ہے، یہ بھی شکر گزاری ہی کی ایک قسم ہے، دراصل مؤلف کتاب کی نظر ناموں کی کثرت پر نہیں رہی، اس حدیث پر رہی ہے کہ جو لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا وہ اللہ رب العزت کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا، ان کے اس عمل کو ہمیں اسی خانے میں ڈالنا چاہیے کہ گو انہوں نے جملے اور الفاظ میں کہیں اللہ کا شکر نہیں ادا کیا ہے، لیکن ان کے کلمات تشکر اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ سودائے قلب میں اللہ کے لئے بھی تشکر کے کلمات موجزن ہیں، عرض مؤلف کا اختتام اس کاوش کی مقبولیت اور مزید علمی کاموں کی توفیق کے لئے دعا پر ہوا ہے۔

ایک مضمون ''خیال خاطر'' کے عنوان سے حضرت امیر شریعت دامت برکاتہم کا بھی شامل کتاب ہے، جو ان کی فطری تواضع کا بہترین مظہر اور اپنے بڑوں کی قدردانی کا بہترین نمونہ ہے، کتاب

کے شروع میں ہی سورہ نساء: ۵۹ کی وہ آیت دی گی ہے جس سے امیر شریعت کی اطاعت پر استدلال کیا جاتا ہے، اس کے بعد ''خراج محبت''، ''کلمات تبریک''، ''اظہار تاثرات'' کے تحت ملک کے نامور علماء، اکابر، دانشوران، سیاسی لیڈران کے حضرت سے متعلق تاثرات جمع کردیے گئے ہیں، ان تینوں ابواب کی الگ الگ ضرورت میرے سمجھ میں نہیں آپائی، اسے اگر ایک نہیں تو دو ہی عنوان کے تحت سمیٹا جاسکتا تھا، زیادہ سے زیادہ اظہار تاثرات اور خراج محبت کافی تھا، چونکہ باتیں سب میں تقریباً یکساں ہیں، اجمال وتفصیل کو نظر انداز کردیں تو سب خراج محبت کے ہی قبیل کی چیزیں ہیں، یہ مندرجات اس اعتبار سے بہت اہم ہیں کہ اس کے ذریعہ ملک کے مختلف مکتب فکر کے قابل ذکر لوگوں کی آرا قلم بند ہوگئی ہیں، ان حضرات کی تحریر سے اس کتاب کی وقعت بڑھی ہے، اور حضرت امیر شریعت کی زندگی کے بہت سارے اہم گوشے ضبط تحریر میں آگئے ہیں، اتنے سارے لوگوں سے لکھوالینا اعتراف عظمت کے باوجود آسان کام نہیں ہے، عزیزم عارف اقبال کا کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے ان حضرات کو لکھنے پر آمادہ کیا، انہوں نے اس سلسلے کی تلخ وشیریں یادوں کو صفحہ قرطاس پر رقم نہیں کیا ہے، اچھا ہی کیا؛ کیونکہ بقول مرزا غالبؔ

سفینہ جب کہ کنارے سے آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم وجورِ ناخدا کیسے

کتاب کا پہلا باب ''روبرو'' صفحہ ۱۲۸ سے شروع ہوتا ہے، جو حضرت امیر شریعت سے لئے گئے انٹرویو پر مشتمل ہے، اس میں حضرت امیر شریعت نے پہلی بار تفصیل سے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اور بہت کھل کر مختلف مسائل پر اظہار خیال کیا ہے، یہاں بھی اگر میری یادداشت دھوکہ نہیں کھا رہی ہے تو پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں فرق ہے اور بہت کچھ حذف کیا گیا ہے اور انہیں حضرت امیر شریعت کا یہ قول برمحل اور حقیقت سے قریب تر معلوم ہوگا کہ ''یا اللہ! میں نے امارت شرعیہ کے نظام کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھا اور تسبیح کے اس دھاگے کو ٹوٹنے اور اس کے بکھرنے سے بچائے رکھا، بس یہی عمل لے کر آیا ہوں''۔ (صفحہ نمبر ۵)

اس کے بعد دوسرے باب سے ''سوانحی خاکہ'' شروع ہوتا ہے، تیسرا باب ''امیر شریعت

بحیثیت معلم''، چوتھا ''باب تنظیم ودعوت''، پانچواں باب ''قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند''، چھٹا باب ''خدمت خلق''، ساتواں باب ''مسلم پرسنل لابورڈ کی خدمات کے تابندہ نقوش''، آٹھواں باب ''دست شفقت کے مرہون میں کون کون''، نواں باب ''خامۂ ہفت رنگ'' جو خطبات، زمانہ طالب علمی کے شخصی اصلاحی مضامین اور مکاتیب کو شامل کیا گیا ہے، دسواں باب ''خبر نامہ کے اداریئے''، گیارہواں باب ''امیر شریعت کی شاعری'' اور بارہواں باب ''کہتی ہے خلق خدا''، کے عنوان سے ہے، جس میں اہل علم اور شعراء کے تاثرات امیر شریعت کے بارے میں نثر ونظم میں پیش کیا گیا ہے، یہ بھی دراصل خراج محبت ہی ہے اور اسے بھی آغاز کتاب میں رکھا جاسکتا تھا، کتاب کا اختتام امیر شریعت کے حوالہ سے مختلف اخبارات کے تراشے پر ہوتا ہے، جو اپنی طباعت کے اعتبار سے اس کتاب پر بدنما داغ ہے، کاش اخبارات کے تراشے کو رنگین چھاپا جاتا تو اس کی دستاویزی حیثیت ہوتی، موجودہ طباعت میں تو ساری تصویریں اس طرح دھندلی ہوگئی ہیں کہ کئی کا پہچاننا بادی النظر میں مشکل لگتا ہے۔

اس کتاب کو تین سو اسی صفحات پر مکمل کیا جاسکتا تھا، اگر اس کتاب کی تالیف میں سوانح نگاری کے فن کو برتا جاتا، خطبات، مضامین، اداریئے، خطوط نگاری، اور غزل، نظم وغیرہ کو شامل کتاب نہیں کیا جاتا، اسے کسی دوسری کتاب کے لئے رکھ چھوڑا جاتا، اسی طرح امارت شرعیہ اور مسلم پرسنل لابورڈ کے تفصیلی تعارف کے بجائے اجمال کو راہ دیا جاتا تو صفحات اور بھی کم ہوسکتے تھے، ان کی جگہ پر ضرورت تھی کہ حضرت امیر شریعت کی نثر اور ان کی شاعری، نظم کے محاسن اور اسلوب نگارش پر تفصیلی کلام کیا جاتا، اسی طرح حضرت امیر شریعت کی مکتوب نگاری کو خصوصیت پر روشنی ڈالی جاتی، نثر ونظم سے استدلال کیا جاتا تو یہ کتاب انتہائی جامع ہوتی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ طوالت کیوں در آئی، اور یہ کمی کیوں رہ گئی، اس کی وجہ یہ رہی کہ اس کتاب کی ترتیب میں مشیر کار بہت رہے، عارف اقبال اس میدان میں نووارد ہیں، سب کی سنتے رہے اور سب کا دل رکھتے رہے، وہ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں؛ لیکن پی ایچ ڈی اور تحقیقی مقالوں سے متعلق یہ بات ان کی نگاہ سے اوجھل رہی کہ گائیڈ اور رہنما ایک ہی ہوتا ہے، مشورہ لیا تو سب سے جاتا ہے لیکن اس کو شامل کرنا ہے یا نہیں اس کا فیصلہ ایک گائیڈ کرتا ہے، تب کتاب ٹھیک ٹھاک تیار ہوتی ہے، سب کی رائے اور سب کے مشورے کو قابل عمل سمجھ لیا جائے گا تو یہ کھچڑی تیار ہوگی یا چوں چوں کا مربہ، یہ تو ہمارے امیر شریعت کی

کرامت ہے کہ اتنے مشیر ہونے کے باوجود یہ کتاب اتنی اچھی مرتب ہوگئی اور اتنی اچھی چھپ گئی، مؤلف کتاب اور ناشر دونوں اس کے لئے شکریہ کے مستحق ہیں۔ محمد عارف اقبال کی یہ پہلی کتاب ہے اور اس پہلی کتاب میں ہی انہوں نے اپنی سلیقہ مندی، تحقیقی ذوق، علمی جد وجہد کا اہل علم سے خراج وصول کرلیا ہے، اس کتاب سے ان کے روشن مستقبل اور تابناک تصنیفی کاموں کا زریں دور شروع ہوتا ہے اور ہم اس زریں دور کے نقطہ عروج کو دیکھنے کے لئے دیر تک جینا چاہتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ یہ کتاب حضرت امیر شریعت کی طرح ہندوستان میں مشہور ہوگی اور اس کا نفع عام وتام ہوگا۔ (())

ذکی احمد: شخصیت اور شاعری——ایک مطالعہ

ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق حاجی پوری کا نام وکام علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں ہے، وہ مختلف موضوعات پر لکھتے رہے ہیں، سمینار اور ادبی پروگراموں میں ان کی شرکت ہوتی رہی ہے۔ ایک بڑی خوبی ان میں یہ ہے کہ کسی بھی سمینار میں خالی ہاتھ نہ جاتے ہیں اور نہ آتے ہیں۔ خالی ہاتھ نہ جانے کا مطلب تو آپ سمجھتے ہیں کہ بغیر مقالہ کے شریک نہیں ہوتے، رہ گئی خالی ہاتھ نہ آنے کی بات تو اس کا مطلب نذرانہ، محنتانہ اور رخصتانہ نہیں ہے، یہ تو مولیوں کو بھی اب لوگ نہیں دیتے جو ہمیشہ سے کارِ ثواب سمجھا جاتا رہا ہے، ڈاکٹر مشتاق احمد کو کون دے گا، میری مراد معلومات سے دامن بھر کر لوٹنے سے ہے۔ ان کا بس چلتا ہے تو سارے مقالے حاصل کر لیتے ہیں، نہیں تو اتنی بار فون کریں گے اور اتنا خط لکھیں گے کہ آپ کو دینا ہی ہوگا، جب مقالے حاصل ہو گئے تو اب ان پر کتاب تیار کریں گے، نہیں ممکن ہوا تو سارے مقالے کو کسی رسالہ کو بھیج دیں گے تاکہ گوشہ ہی آجائے۔ اب جب کتاب چھپ کر آئی، کسی پرچہ کا گوشہ آیا تو آپ دیکھ کر متحیر ہوئے کہ اچھا! اتنا شاندار کام ہوا، اتنا خوبصورت چھپا، اتنا قیمتی مجموعہ آگیا۔ مشتاق صاحب ہیں کہ سب سے داد وصول کر رہے ہیں۔

میں ان کے نام کے آخری مشتاق پر ہمیشہ غور کرتا رہا ہوں کہ آخر اس کا کیا مصرف ہے؟ کبھی دو چار مصرعے تو ان سے سنے نہیں، کبھی ایسے ہی دیوان بغل میں دبائے آکھڑے ہوں کہ یہ رہی عمر بھر کی کمائی اور یہ رہا دوسرے مشتاق کا کمال، یعنی پہلا مشتاق احمد نثر کا اور دوسرا مشتاق شاعری کا، تو اور بات ہے۔ جب تک ایسا محیر العقول معاملہ سامنے نہیں آتا، ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ لوگوں پر جو کچھ وہ لکھتے رہے ہیں اور جس طرح کتابیں تیار کرتے ہیں، اس کی داد وصول کرنے کے لیے ایک دوسرا مشتاق بھی تخلص کی شکل میں ساتھ لگا رکھا ہے۔

یہ تمہید اس لیے قائم کی گئی ہے تاکہ آپ کو بتاؤں کہ ایسے ہی سمیناری مقالوں پر مشتمل ایک

سو بارہ صفحات کا ایک مجموعہ ذکی احمد کی شخصیت اور شاعری پر ابھی حال میں جلوہ افروز ہوا ہے، ٹائٹل، سبحان اللہ، کاغذ وطباعت ماشاء اللہ اور مواد الحمدللہ، آنکھیں چمک اٹھتی ہیں، دل میں دیکھ کر فرحت و سرور کی لہر اٹھتی ہے اور دماغ شاد کام ہوتا ہے۔ روایت ایسے موقعوں پر مبارک باد دینے کی رہی ہے، سو وہ بھی قبول کر لیجئے۔

ڈاکٹر مشتاق احمد نے اس کتاب میں ذکی احمد کی شخصیت اور شاعری پر ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، انوار الحسن وسطوی، سید مصباح الدین احمد، مشتاق شمسی، عبدالرافع، ارشد ترابی، ڈاکٹر شکیل احمد خاں، عارف حسن وسطوی، کے مقالے جمع کیے ہیں، ناصر زیدی، واحد نظیر، عبدالغفور شمس کا منظوم کلام بھی شامل کتاب ہے۔ پروفیسر ثوبان فاروقی نے حسب روایت مختصر مگر جامع لکھا ہے۔ نذر الاسلام نے ''اس کتاب کے بارے میں'' جو کچھ لکھا ہے وہ وقیع بھی ہے اور قیمتی بھی، ان کو پڑھتے وقت مجھے بہت غصہ آتا ہے، کہ انھوں نے لکھنا اور چھپنا کیوں بند کر دیا ہے؟ فکر معاش کے ساتھ وہ یہ کام بھی کرتے رہتے تو ہمارے ادبی سرمایہ میں قیمتی اضافہ ہوتا، ان کے اس سرمایہ پر ہم سب کا حق ہے اور انھیں چاہئے کہ ہمارا حق ہمیں دیں، ہم تو شریف مولوی ٹھہرے، بعض لوگ حق چھیننے پر بھی یقین رکھتے ہیں اور تحریریں جبر واکراہ کے ساتھ بھی وجود میں آتی رہتی ہیں، برضا ورغبت کی اس میں قید نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ نظمی کا قلم اس کتاب پر لکھتے وقت خوب چلا ہے، اندر کی بات مشتاق صاحب ہی بتائیں گے کہ یہ برضا ورغبت ہے یا بالجبر واکراہ۔

کتاب پر لکھتے وقت نظمی کی جو کیفیت رہی ہو، صحیح اور سچی بات یہ ہے کہ ذکی احمد ہم سب کی پسند ہیں، ان کی شخصیت میں جو سادگی اور جاذبیت ہے، ان کی شاعری میں جو خلوص اور سنجیدگی ہے وہ اہل قلم سے خراج تحسین وصول کر لیتی ہے، ذکی صاحب نے ہر طبقہ کے لیے لکھا ہے، ان کا اپنا مرثیہ ہو، یا بچوں کی نظموں کا مجموعہ جھولا، سیل رواں ہو یا میٹھے گیت، ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں، ان میں ہیئت کی پاسداری، روایت کا رکھ رکھاؤ، رچا بسا ہوا ہے۔ پروفیسر ثوبان فاروقی نے بجا لکھا ہے:

''ذکی احمد شاعری کے حوالے سے کسی نوع کی بے جا آزادی کے قائل نہیں، ان کی شاعری جدیدیت کے منفی اثرات سے بڑی حد تک گریزاں ہے، ان کی پابند نظمیں ان کے کلاسیکی رجحان کی غماز

ہیں،مثنوی کی ہیئت میں ان کا مرثیہ جوان کے نجی حالات اور واقعات پر مشتمل ہے،اسے بجا طور پر جدید اردو شاعری کا ایک شاہکار کہنا چاہئے''۔ان کی غزلیں ان کے لطیف احساسات وجذبات کی مدھم مگر مدھر سرگوشیاں ہیں''۔(حرف اول صفحہ ۴)

اس کتاب میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کے تین مقالے''ذکی احمد کی غزل گوئی''ذکی احمد کی تخلیق۔۔اپنا مرثیہ''ایک جائزہ''جھولا۔۔ایک تبصرہ ایک تعارف''شامل ہے۔جس میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے ذکی احمد کی غزل گوئی،اپنا مرثیہ اور جھولا پر تفصیلی بحث کی ہے۔ان کی رائے میں:

''ذکی احمد کی غزل میں دھیمے دھیمے پگھلنے کی ایک کیفیت بھی ملتی ہے،حزن کی ایک ہلکی سی رو، ان کی غزل کی رگوں میں دوڑتی ہے،ان کا لہجہ مدھم اور ان کی آواز شکستہ وخستہ معلوم ہوتی ہے''۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہمدرد ہیں، یہ ہمدرد، ہمدردی والا نہیں، تخلص والا ہے۔اس تخلص نے ان کی زندگی میں ہمدردی کو بھی داخل کر دیا ہے،عموماً ادیبوں کے ساتھ ان کی ہمدردی ایک ہی بار ہوتی ہے، ایک ہی شخص پر بار بار لکھنا وہ پسند نہیں کرتے، لیکن ذکی احمد کی موزونیت، قادرالکلامی اور سادگی ایسی بھائی کہ تین تین مقالہ لکھ دیا، ذکی احمد کی سادگی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ سادگی زبان کی بھی ہے اور فکر وخیال کی بھی، بحور، لفظیات، پیرایہ ہائے اظہار ہر اعتبار سے ان کی غزلیں سادگی کی حامل ہیں، پیچیدہ بیانی، مشکل پسندی ان کی غزل میں کہیں نظر نہیں آتی۔ذکی احمد لطیف اور مشکل مضمون کو بھی سادہ انداز میں سوچتے اور پیش کرتے ہیں، مگر ان کی سادگی، پھیکی، بے رس اور بے مزہ نہیں ہوتی، بلکہ تازہ شگفتہ، حسین ودلنشیں ہوتی ہے۔''(ذکی احمد کی غزل گوئی صفحہ ۱۱)

ذکی احمد کی شاہکار تخلیق''اپنا مرثیہ''پر اس مجموعہ میں چار مقالات شامل ہیں۔ایک ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا دوسرا محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، تیسرا سید مصباح الدین احمد اور چوتھا ارشد ترابی کا، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اس کی بڑی خوبصورتی اور خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اس میں شاعر کی ذاتی زندگی کے واقعات کے ساتھ آج کے مسلم معاشرے کی اخلاقی، معاشرتی اور تمدنی زندگی کے بے شمار جلوے بڑی بے ساختگی سے جمالیاتی کیفیتوں اور شعری

لطافتوں کے ساتھ محفوظ ہو گئے ہیں۔عصری حسیت کا ایسا سادہ اور نادر و بدیع نمونہ، جدید ادب میں شاید بہت تلاش کے بعد بھی نہ ملے''۔

(ذکی احمد کی تخلیق'اپنا مرثیہ'پر ایک جائزہ صفحہ ۵)

حالاں کہ غزلوں کے حوالہ سے ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ:

''ان کی غزل میں سیاسی موضوعات ومعنویت کی تلاش بے سود ہوگی اور ان میں عصری حسیت کا سراغ لگانا کوشش فضول ثابت ہوگا''(ذکی احمد کی غزل گوئی صفحہ ۱۰)

ثناء الہدیٰ قاسمی نے اپنے تفصیلی مقالہ میں''اپنا مرثیہ''کے فکر وفن، ندرت خیال اور ٹائٹل کے دروبست اور مندرجات کا جائزہ لیا ہے اور لکھا ہے کہ:

''اپنا مرثیہ فنی طور پر مثنوی اور فکری طور پر مرثیہ ہے، اپنا بھی اور قوم وملت کا بھی''۔

سید مصباح الدین احمد نے''اپنا مرثیہ''کو ایک قلب تپاں کی آواز قرار دیا ہے۔لکھتے ہیں:

''ذکی احمد کی یہ تخلیق وقتی جذبے یا شاعرانہ رنگ کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بالغ نظر فنکار، ایک حساس اور دردمند شاعر کے قلب تپاں کی آواز ہے''۔(صفحہ ۵۲)

ارشد ترابی نے''اپنا مرثیہ''کو ان کی بالغ نظری اور پختہ سیاسی شعور کا آئینہ دار قرار دیا ہے۔لکھتے ہیں:

''چھوٹی بحر میں یہ اشعار ان کی بالغ نظری اور پختہ سیاسی شعور کے آئینہ دار ہیں جن سے قنوطیت کے بدلے حرکت وعمل کا درس ملتا ہے''۔(صفحہ ۶۷)

''جھولا''ایک تبصرہ ایک تعارف میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے ہمیں بتایا ہے کہ:

''یہ نظمیں نرسری کے بچوں کے لیے نہیں بلکہ کچھ ہوش مند بچوں کے لیے ہیں۔اس لیے اس میں شاعر سے اعلیٰ شعری تخلیق اور فلسفے کی توقع نہیں کی جانی چاہئے، یہاں علامتوں، اشاروں، کنایوں، ابہام، استعاروں کی گنجائش نہیں ہوتی، اس کے باوجود یہ نظمیں، جس مقصد کے تحت لکھی گئی ہیں، اس میں یہ بے حد کامیاب ہیں، زبان کی چاشنی، دل کی منظر نگاری، دلنشیں نصیحت یہ سب چیزیں اس طرح آپس میں شیر وشکر ہو گئی ہیں کہ ان کو الگ الگ کر کے دکھانا مشکل ہے''۔(صفحہ ۸۲)

مجموعی طور پر ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ:

''ذکی احمد کی شاعری لفظوں کی بازی گری، اوزان وبحور اور ہیئتوں کے نت نئے تجربوں کی شاعری نہیں ہے، وہ روایتی ہیئتوں اور سانچوں میں بڑی سادگی اور سہولت سے اپنے احساسات وتاثرات کی ترجمانی کر لیتے ہیں، ہندی الفاظ کے برمحل استعمال سے ان کا کلام اور ہنس مکھ ہو جاتا ہے''۔(صفحہ۸۰)

ڈاکٹر صاحب کے مقالوں پر تبصرہ کچھ طویل ہو گیا ہے، کیا کیجیے گا؟ بعض لوگوں پر لکھنے بیٹھئے تو ''چل مرے خامے بسم اللہ'' کہئے اور قلم جو چلتا ہے تو رکتا ہی نہیں، میں نے بھی اسے آزاد چھوڑ دیا، اس لیے بھی کہ ہم عصروں میں ڈاکٹر مشتاق کا امتیاز، ممتاز کی بے پناہ توجہ کا رہین منت ہے۔ اس زاویہ سے سوچئے تو یہ حق تھا کہ ان کے مقالوں پر گفتگو طویل ہو۔

آگے بڑھئے، ایک اور مقالہ نگار کا ذکر کرتے ہیں اور وہ ہیں انوارالحسن وسطوی ''آشیانہ'' میں ''گھر'' بنا رکھا ہے۔ انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری ہیں، لکھتے بھی ہیں اور چھپتے بھی ہیں، کسی مہینے میں تحریر نظر سے نہ گزرے تو اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ مزاج دشمناں ناساز تو نہیں، ممتاز ومشتاق کے ساتھ جب تک ان کا نام نہ لیا جائے، مثلث بنتا ہی نہیں، اب مثلث کون سمجھتا ہے، چلئے ترجمہ سمجھئے، اردو آبادی میں بھی اب مثلث، مربع، مساوی الاضلاع جیسی اصطلاحیں اجنبی ہو گئی ہیں۔ اسی لیے مثلث کو ترجمہ سمجھانا پڑتا ہے۔ کس کو کہئے اور کس کا ماتم کیجیے۔

بہر کیف! بات چل پڑی ہے انوارالحسن وسطوی کی، ان کے دو مقالے ''ذکی احمد ـــــ ایک تعارف ایک تاثر'' اور ''بچوں کا شاعر ـــــ ذکی احمد'' اس مجموعے میں شامل ہیں۔ دیگر مقالہ نگاروں نے شاعری پر بہت کچھ لکھ ڈالا تھا شخصیت پر گفتگو کم ہوئی تھی، اس لیے یہ مقالہ اگر شامل کتاب نہ ہوتا تو ذکی احمد کی حیاتی تقویم کی کمی کھٹکتی اور شخصیت کا گوشہ تشنہ رہ جاتا، انوارالحسن وسطوی نے اس مقالہ میں ان کی خاندانی وجاہت، علمی پس منظر اور دیگر مشغولیات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ اور بجا لکھا ہے کہ:

''ان بزرگوں کی صحبت نے ذکی احمد کی شخصیت کو جلا بخشی، دینی، علمی اور ادبی ماحول میں پرورش پانے کی وجہ سے وہ شریف النفس سنجیدہ اور مثالی انسان بن سکے''۔(صفحہ۴۷)

بچوں کا شاعر ذکی احمد میں انوارالحسن نے ان کی شاعری کے مختلف ادوار پر روشنی ڈالی ہے اور بچوں کے لیے ان کی جو شاعری ہے اس کا بھر پور جائزہ لیا ہے، انھوں نے عبدالقوی دسنوی کے حوالہ سے ہمیں یہ بتایا ہے کہ بچوں پر لکھنا کتنا دشوار ہے۔ موضوعات کے تنوع کے باوجود بچوں کے لیے جو شاعری ذکی احمد نے کی ہے اس کا امتیاز انوارالحسن وسطوی صاحب کی نظر میں یہ ہے کہ:

''تمام نظموں میں بچوں کو پند ونصیحت کی ہے، کہیں اخلاقی درس ہے تو کہیں عمل کی ترغیب، کہیں حصول علم کی تلقین ہے تو کہیں علم حاصل نہ کرنے کے نقصانات کا بیان''۔(صفحہ۴۳)

انوارالحسن صاحب نے انھیں اسمٰعیل میرٹھی اور شفیع الدین نیر کی طرح بچوں کا شاعر تو نہیں مانا ہے، البتہ انھیں دوسرے بڑے شاعروں کے ساتھ ادب اطفال میں جگہ دی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ادب اطفال میں ان کی جو تخلیقات ہیں ان کی بناء پر نظیر اکبرآبادی، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، افسر میرٹھی، حفیظ جالندھری، علامہ اقبال، احمد ندیم قاسمی، اسلم جیراجپوری، جگن ناتھ آزاد، سراج انور اور علقمہ شبلی جیسے شاعروں کی صف میں ضرور شامل کیا جاسکتا ہے''۔(صفحہ۴۷)

لیکن جناب عبدالرافع صاحب کی رائے ہے:

''بچوں کے شاعر کی حیثیت سے اسماعیل میرٹھی اور شفیع الدین نیر کے بعد اگر اعتماد کے ساتھ کسی شاعر کا نام لیا جاسکتا ہے تو وہ ذکی صاحب ہی ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی نظموں کے لیے موضوع کا انتخاب اور پھر ان کا انداز بیان، اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی نظموں میں طنز بھی ہے۔ مزاح بھی ہے، پند ونصائح بھی ہیں، اخلاق وکردار سازی بھی ہے''۔(سیل رواں۔ایک مطالعہ،صفحہ۵۶)

عبدالرافع صاحب نے ذکی احمد کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''وہ ایک اچھے استاذ بھی ہیں، ایک قادرالکلام شاعر بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک نہایت ہی اچھے انسان ہیں مخلص، ملنسار، با اخلاق، نرم خو اور نرم گو، بے حد پاک طینت''۔(صفحہ۵۳)

دوسرے مقالہ نگاروں کی طرح عبدالرافع صاحب نے بھی سادگی، بے ساختگی، پرکاری، شدت جذبات کا اظہار اور موضوع کے انتخاب کو ان کی شاعری کی خصوصیات قرار دیا ہے اور لکھا ہے:

''ذکی صاحب کی شاعری میں مطالعہ بھی ہے، مشاہدہ بھی ہے، فکر بھی ہے اور تدبر بھی ہے اور

سب سے بڑی بات یہ کہ انفرادیت بھی ہے''۔(صفحہ۵۶)

مشتاق شمسی نے ذکی احمد کو بے نیاز شاعر قرار دیا ہے، جنھیں نہ صلے کی تمنا ہے اور نہ ستائش کی خواہش، وہ ان چیزوں سے بے نیاز ہیں، ان کے اشعار کی شگفتگی اصل ہے، حالاں کہ وہ پوری زندگی غم دوراں اور غم جاناں کے شکار رہے ہیں، مشتاق شمسی نے دوسرے کئی مقالہ نگاروں کی طرح ان کی نثر نگاری پر بھی اپنی رائے دی ہے اور خوب دی ہے۔ لکھتے ہیں:

''ذکی احمد صرف شاعر ہی نہیں بلکہ منفرد انداز کے نثر نگار بھی ہیں اگر چہ اردو میں انھوں نے کم لکھا ہے؛ لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ جامع ہے اور چند صفحات کی تحریر طولانی تحریروں پر بھاری ہے، اس میں خلوص، سچائی، شگفتگی اور روانی ایسی ہے کہ پڑھتے وقت قاری اپنا سب کچھ بھول جاتا ہے، مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، مشتاق احمد نوری، شفیع جاوید، پروفیسر نجم الہدیٰ وغیرہ ذکی احمد کی نثر کے بے حد معترف ہیں''۔

پیش لفظ کو بھی مضمون مان لیجیے تو ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق کے دو مضامین اس مجموعہ کی زینت ہیں، پیش لفظ میں انھوں نے عرض حال کیا ہے، تاکہ ہم پرسش احوال سے بچ جائیں، اور ذکی احمد شخصیت کے چند گوشے میں انھوں نے ذکی صاحب کی شخصیت کے بعض اہم گوشوں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں سے بھی روشناس کرایا ہے، انھوں نے ہمیں برمحل یہ مشورہ بھی دیا ہے:

''ہم لوگوں کو اپنے ادباء وشعراء کا احترام کرنا چاہئے اور انھیں صحیح مقام دینا چاہئے''(صفحہ۷۸)

مشتاق صاحب نے یہ مشورہ ہی نہیں دیا ہے بلکہ اس ڈگر پر چل کر سمت سفر کی تعین بھی کی ہے۔ اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ وہ قول وعمل کے تضاد کے نہ قائل ہیں اور نہ شکار۔ آج کے اس دور میں یہ بڑی بات ہے۔

ڈاکٹر شکیل احمد خاں لکچرر شعبہ اردو سبھاش چندر بوس میٹری کالج لال باغ مرشد آباد نے ذکی احمد کی نظم نگاری کو اپنا موضوع سخن بنایا ہے۔ انھوں نے ان کی شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ انھوں نے پہلے دور میں جو ۱۹۰۹ء سے شروع ہوتا ہے غزلوں کی کثرت اور چند نظموں کا تذکرہ

کیا ہے، دوسرا دور ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۵ء تک ہے جس میں مناظر قدرت اور ذاتی تجربات کو انھوں نے اشعار میں ڈھالا ہے۔ تیسرا دور ۱۹۶۶ء سے ۱۹۷۵ء کا ہے جب بچوں کے لیے نت نئی ہندی اردو میں انھوں نے نظمیں لکھیں۔ چوتھا دور ۱۹۷۶ء سے تا حال ہے، جس میں مختلف موضوعات پر انھوں نے نظمیں لکھی ہیں، جن میں ذہنی بالیدگی اور فنی پختگی ہے۔ شکیل احمد خاں نے نظم کے حوالہ سے جذبات نگاری، منظر نگاری وغیرہ پر بھی بحث کی ہے۔

اس مجموعہ کا آخری مضمون ''ذکی احمد ادیبوں کی نظر میں'' ہے، ان میں نادم بلخی، پروفیسر نجم الہدیٰ، حسن امام درد، ڈاکٹر رئیس انور، عبدالمنان طرزی، عفت موہانی، مشتاق احمد نوری، کلدیپ گوہر، ڈاکٹر نجیب اختر، ڈاکٹر ریحان غنی اور واحد نظیر کے آراء شامل کیے گئے ہیں۔ مجموعہ میں جن حضرات کے مقالے ہیں، ان کی آراء شاید تکرار کے نقطۂ نظر سے شامل نہیں کی گئی ہیں۔ اگر ان کو بھی شامل کرلیا جاتا تو یہ جامع مقالہ ہوجاتا کیوں کہ ہر مقالہ غزل کے شعر کی طرح ایک اکائی ہوتا ہے، اور اس اکائی کو جامع ہونا چاہئے۔ اس مجموعہ سے نکال کر اس مقالہ کو دیکھیں تو تشنگی کا احساس ہوگا۔

مجموعہ میں ناصر زیدی کا منظوم خط بہ نام ذکی احمد شامل ہے۔ جو اصلاً ''اپنا مرثیہ'' ملنے کی رسید ہے۔ جس میں اپنا مرثیہ بھیجنے اور یادآوری کا شکریہ ادا کیا گیا ہے۔ واحد نظیر نے ۲۳/اپریل ۱۹۹۵ء کو الوداعیہ کے موقع سے عقیدت کے جو پھول کھلائے تھے، اس کو بھی شامل کتاب کرلیا گیا ہے۔ واحد نظیر نے ذکی احمد کو میل کا وہ پتھر قرار دیا ہے جس سے منزل کا نشان ملتا ہے۔

جس سے منزل کا نشاں ہم پائیں گے
اے ذکی وہ میل کا پتھر ہے تو

پروفیسر عبدالغفور شمس کے ندرانۂ خلوص پر یہ کتاب ختم ہوتی ہے۔ یہ نذرانہ خلوص ۱۶/اپریل ۱۹۹۵ء کو مدرسہ فردوس العلوم لعل گنج ویشالی کے الوداعیہ میں پیش کیا گیا تھا۔ عبدالغفور شمس بقامت کہتر اور بہ قیمت بہتر کے صحیح مصداق ہیں اردو، فارسی، عربی زبان وادب پر ان کی گہری نظر ہے اور اچھی شاعری کرتے ہیں، نذرانۂ خلوص کے یہ چند اشعار دیکھئے اور مجھے اجازت دیجئے۔

یہ علاقہ تیرے خونِ دل سے لالہ زار ہے
اب کہاں آئے گا کوئی تجھ سا دیوانہ ذکی

علم و فن کا یہ چمن تھا تیرے دم سے پُر بہار
تو تھا اک روشن دیا اور ہم تھے پروانہ ذکی

ہم نہ بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی صحبت تری
یاد آئیں گے ہمیں بے اختیارانہ ذکی

مدرسہ، اسکول، یہ غربت کدے اور یہ ڈگر
دم بخود ہیں آج کھوکر تجھ سا مستانہ ذکی

ہادیٔ دیں، مرثیہ ، جھولا وہ تصویرِ بتاں
نغمات خواند شبان عندلیبانہ ذکی

تو رہے چاہے جہاں بھی شادکام زندگی
گرددت ہر روز افزوں شان جانانہ ذکی

مولانا محمد نبی اختر مظاہری اوران کی شاعری

امارت شرعیہ کی مجلس شوری کے رکن ، اچھے منتظم ، بہترین مدرس ، باوقار عالم دین ، شاعر وادیب ،سماجی خدمت گار اور ہر دم جواں پیہم دواں رہنے والی شخصیت مولانا الحاج ڈاکٹر محمد نبی اختر مظاہری پرنسپل مدرسہ عزیزیہ جامع مسجد پوپری بازار ضلع سیتامڑھی کا ۲۵ اکتوبر ۲۰۱۰ بروز سموار ۹ بجے شب انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون، انتقال کے وقت ان کی عمر باسٹھ سال تھی اور چند ماہ سے وہ منہ کے کینسر کے عارضہ میں مبتلا تھے، ٹاٹا میموریل ممبئ میں آپریشن بھی ہو چکا تھا،لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی ،اور بالاخر وقت موعود آ گیا ۲۶/اکتوبر ۲۰۱۰ کو بعد نماز ظہر ان کے منجھلے صاحبزادہ مولانا محمد شمیم اختر ندوی نے جنازہ کی نماز پڑھائی ،اور ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں (جن میں بڑی تعداد علماء، صلحاء اور صوفیا کی تھی) گاڑھا کے قبرستان میں حضرت مولانا عبدالعزیز بسنتیؒ کی قبر سے متصل، جانب مغرب وجنوب سپرد خاک کئے گئے، پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ پانچ لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔

مولانا محمد نبی اختر مظاہری نے ۵/دسمبر ۱۹۴۸ کو اپنے آبائی گاؤں گاڑھا ضلع سیتامڑھی میں آنکھیں کھولیں ، والد مولانا حکیم منظرالحسن بن مولانا صوفی محمد سلیم بن شیخ دکھا بن شیخ بابر علی بن شیخ حسنی بن شیخ کرم اللہ علاقہ کے نامور علمی اور روحانی شخص تھے، آپ کی والدہ بھی صوم وصلوۃ کی انتہائی پابند اور علوم دینیہ کی واقف کار تھیں ، مولانا مرحوم کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل نیز صلاحیت وصالحیت میں اس خاندانی ماحول کا بڑا اہم رول رہا ہے۔

ابتدائی تعلیم مدرسہ عزیزیہ جامع مسجد پوپری سے حاصل کرنے کے بعد جامعہ رحمانی مونگیر تشریف لے گئے ، جہاں انہوں نے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی سے فقہ کی ابتدائی کتابیں پڑھیں ،اور حضرت امیر شریعت رابعؒ کی شفقت ومعیت سے بہرہ ور ہوئے ،مونگیر کے بعد آپ نے مدرسہ جامع العلوم کان پور میں داخلہ لیا اور اس وقت کے نامور اساتذہ حضرت مولانا مفتی محمود الحسن

گنگوہی اور مفتی منظور احمد کانپوری کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا وہاں سے مظاہر علوم سہارن پور تشریف لے گئے اور ۱۹۶۷ء میں فراغت پائی، دینی علوم کسب معاش کی بنیاد نہ بنے، اس کے لئے انہوں نے پٹنہ سے ہومیو پیتھک کی ڈگری لی، پٹنہ میں قیام کے دوران کچھ درس وتدریس کا بھی سلسلہ رہا، اسی زمانہ میں آپ کی پہلی کتاب ''شادی۔ کتاب وسنت کی روشنی میں'' اشاعت پذیر ہوئی۔

۱۹۶۶ء میں اپنے پھوپھا محمد الیاس ساکن نور چک بسفی مدھوبنی کی دختر نیک اختر اسماء خاتون سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے، ۱۹۷۳ء میں مدرسہ عزیزیہ پوپری بازار کے استاذ مقرر ہوئے، زندگی کے آخری دوسال بحیثیت پرنسپل ادارہ کی خدمت میں گذارے، مجموعی طور پر ۳۷ سال آپ نے اس تعلیمی ادارہ کی خدمت کی اور ہزاروں طلبہ وطالبات نے آپ سے کسب فیض کیا، جامع مسجد پوپری کے جمعہ کی امامت وخطابت بھی آپ سے متعلق تھی، جس سے آپ نے اصلاح معاشرہ کا بڑا کام لیا، جامع مسجد پوپری، مدرسہ عزیزیہ اور مولانا نبی اختر مظاہری اس طرح لازم وملزوم ہوگئے تھے کہ ان سے جدائی کا تصور بڑا جاں گداز اور جاں سوز ہے۔

مولانا مرحوم سے میری ملاقات پرانی تھی، ان کی شادی جس خاندان میں تھی اس خاندان سے میرا بڑا گہرا تعلق رہا ہے، ان کے برادر نسبتی مولانا رئیس اعظم سلفی کے ساتھ میں بھی مدرسہ احمدیہ ابابکر پور میں خدمت تدریس سے وابستہ تھا، ان کے دو برادر نسبتی کی شادی ویشالی ضلع میں ہوئی تھی اس تعلق سے اس خاندان کے بہت سارے معاملات میرے لئے شنیدہ نہیں دیدہ کے مصداق تھے، اس تعلق کی وجہ سے دوبار میرا گاڑھا بھی جانا ہوا تھا، اور ان کی مشہور مہمان نوازی سے لطف اٹھا کر لوٹا تھا۔ مدرسہ بورڈ کی کاپیوں کی جانچ کے موقع سے بھی ملاقاتیں رہا کرتی تھیں۔ امارت شرعیہ میں آنے کے بعد اس تعلق میں مزید پختگی آئی، جب بھی پٹنہ آتے، امارت شرعیہ ضرور تشریف لاتے، علاقہ کے احوال ومسائل سے اکابر کو واقف کراتے، امارت شرعیہ پر انہوں نے کئی نظمیں لکھیں جس میں امارت کی خدمات کا اعتراف اور والہانہ محبت کا اظہار ملتا ہے۔ اکابر امارت بھی ان پر غیر معمولی اعتماد کرتے تھے، علاقہ میں کسی بھی قسم کا کام ہوتا تو ذمہ داران کی نگاہ ان پر ٹک جاتی، پروگرام کا انعقاد ہوتا تو وہ امارت شرعیہ سے کسی نہ کسی کو ضرور بلواتے، حضرت امیر شریعت رابعؒ سے ان کی مراسلت جاری رہتی تھی، جب کبھی ادھر کا سفر ہوتا، مولانا مرحوم اپنے گھر ضرور

دعوت کرتے، دعاء کراتے اور پورے اکرام واحترام کے ساتھ رخصت کرتے، ایک خط میں حضرت امیر شریعت رابعؒ لکھتے ہیں: ''آپ نے جس محبت، خلوص واحترام کے ساتھ مجھے بلایا اور دعوت دی، اس کے لئے اللہ تعالیٰ اجر عظیم عطا فرمائے، بالخصوص گاڑھا میں اپنے گھر لے جا کر گہرے ربط اور تعلق کا ثبوت دیا جس سے میں کافی متاثر ہوا''۔

مولانا کے پاس ایک شاعر کا حساس دل تھا، اس لئے کسی بھی واقعہ کو وہ نظم کے قالب میں ڈھال دیتے، قومی یک جہتی، فرقہ پرستی اور ہندو مسلم ایکتا کے عنوان سے ان کی بیاض میں کئی نظمیں ہیں انہوں نے بابری مسجد کا مرثیہ بھی لکھا اور قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات پر قطعات تاریخ بھی، ان کی بیاض میں غزلوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ہے۔ انتقال کے بعد تعزیت کے لئے ۲۹ نومبر ۲۰۱۰ کو تقریبا ایک ماہ بعد حاضری ہوئی ڈاکٹر کلیم اختر نے والد کے تعلق کو نبھایا، اور ہر طرح آرام پہونچانے کی کوشش کی، ضیافت کا پرتکلف اہتمام کیا اور کئی لوگوں کو مدعو کیا، گاڑھا کے مسلمان بھی میرے آنے کی خبر سن کر مولانا کے دروازے پر جمع ہوگئے، مولانا محفوظ الرحمٰن صابری مظاہری، مولانا انوار اللہ فلک وغیرہ بھی ساتھ رہے، پہلے قبرستان جا کر فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل کی گئی پھر ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ کچھ تعزیتی کلمات کہے گئے اور مغفرت وصبر جمیل کی دعا پر مجلس برخواست ہوئی۔

اسی سفر میں مولانا مرحوم کا مجموعۂ کلام جوان کی ڈائری میں مرقوم تھا، ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر کلیم اختر نے میرے حوالہ کیا تھا، اب اسے میری خوبی کہیے یا خامی کوشش کرتا ہوں کہ ''نام نیک رفتگاں ضائع مکن'' کے جذبہ سے مرحومین کی خدمات کو منظر عام پر لاتا رہوں، دوسروں سے بھی اس کی درخواست کرتا رہتا ہوں۔

میں نے حضرت مولانا آفتاب عالم آفتاب آروی سے درخواست کی کہ وہ اس مسودہ پر نظر ڈال دیں، مولانا خود شاعر ہیں اور عروض وبلاغت، ردیف وقافیہ پر گہری نظر رکھتے ہیں، انہوں نے میرے کہنے کا پاس رکھا اور پوری شاعرانہ مہارت اور استادانہ فن کاری کے ساتھ انہوں نے اس پورے مجموعہ کے اکثر مشمولات کو دیکھا، ''اکثر'' اس لیے کہ بہت سے اشعار بعد میں دستیاب ہوئے، جوان کی نظر سے نہیں گذر سکے، مولانا کی نظر سے جو اشعار گذرے، اس پر انہوں نے اس قدر توجہ کی کہ اگر پس

مرگ استادی شاگردی کا تصور ہوتا تو میں کہتا کہ مولانا مرحوم کو مولانا آفتاب احمد آفتاب کواتھوی آروی سے شرف تلمذ حاصل ہے۔

بات اشاعت تک پہونچ گئی اور آپ ادب کے پرانے قاری ہیں تو یہ بات اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ مرتب کتاب سے ایک مقدمہ، پیش لفظ وغیرہ کی توقع رکھی جاتی ہے، یہ مضمون اسی توقع پر کھرا اترنے کے لیے قلم بند کیا جارہا ہے۔

مولانا نبی اختر مظاہری کی شاعری کو جہاں تک میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے یہاں فکری ترفع کی کمی اور مشاہداتی اثرات زیادہ ہیں، شاعر نے حالات کا مشاہدہ کیا ہے اور اس مشاہدہ سے دل پر جو گذری ہے اسے سیدھے سادے الفاظ میں ذکر کردیا ہے۔ مولویانہ اسلوب اور عالمانہ لب ولہجے سے قطعاً گریز کیا ہے، حالانکہ وہ اس پر قادر تھے، شاعری کے مقام ومرتبے سے قطع نظر وہ اچھے عالم تھے، اس لیے عالمانہ لب ولہجہ پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ لیکن ان کے سامع دیہات کے لوگ تھے، اور زیادہ تر نظمیں، غزلیں مقامی مجلسوں میں پڑھے جانے کے لئے انہوں نے رقم کیں اس لیے وہ سیدھی سادی زبان استعمال کرتے تھے، جو سب کی سمجھ میں آسانی سے آجائے، وہ اختر حسین رائے پوری کے اس قول سے متفق تھے کہ دیکھنا چاہیے کہ شاعر کیا کہتا ہے؟ کیسے کہنے کا سوال بعد میں آتا ہے، وہ رومی کے اس شعر پر یقین رکھتے تھے۔

شعر می گویم بہہ از قند ونبات
من ندانم فاعلا تن فاعلات

ادب کا معیار جس تیزی سے گرا ہے، اس کے پیش نظر آسان شاعری آج کی ضرورت بن گئی ہے۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ برسوں پہلے خدا بخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں ایک ادبی پروگرام ہوا تھا، جس میں اختر الایمان، کیفی اعظمی، علی سردار جعفری جیسے بڑے شعراء شریک ہوئے تھے، شام کو گورنر ہاؤس میں مشاعرہ رکھا گیا تھا، میں بھی باریاب ہوگیا تھا، معیاری کلام پڑھے گیے تھے، لیکن داد کی کوئی آواز نہیں آتی تھی، زوردار آواز داد کی مجمع سے آتی ہے، اور مجمع میں تو ہم جیسے لوگ تھے، جن کی سمجھ سے ان حضرات کا معیاری کلام بالاتر تھا، مجھے یتیم اعظمی مرحوم کا ایک شعر یاد آرہا ہے جو اس

پورے مجمع کی منظر کشی کررہا تھا۔

کلام کچھ پڑھے گیے جو سب نہیں سمجھ سکے
یہ محفل کامیاب رہی ، مگر اسی کمی کے ساتھ

''سب نہیں سمجھ سکے'' میں ہم جیسے لوگ تھے، بہت لوگ سمجھنے والے بھی تھے، لیکن وہ اتنے قدآور لوگ تھے کہ داد کی آواز گلے میں گھٹ کررہ جاتی تھی۔

اختر مظاہری نے اپنی شاعری میں اس کا پورا خیال رکھا کہ کلام سب سمجھ لیں اب اس سمجھانے میں کہیں قافیہ تنگ ہوگیا، کہیں ردیف کا گلہ گھٹ گیا اور کہیں عروض کے زریں تار بکھر کررہ گیے، لیکن اختر مظاہری کو جو کہنا تھا، انہوں نے پورے خلوص کے ساتھ کہا اور مجمع نے پوری محبت کے ساتھ ہر موقع پر ان کا ساتھ دیا۔

''میری سنو'' نعت، غزل، نظم، قطعات، اور متفرق اشعار پر مشتمل ان کا مجموعۂ کلام ہے، ان سب میں شاعر کا سوز دروں اور خلوص پورے طور پر موجزن ہے، ان کے بعض اشعار تو سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہیں۔

آدمی کو آدمی کے کام آنا چاہیے
اپنے رب کے سامنے سر کو جھکانا چاہئے

اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کو اتنے سادے انداز میں شعر کا جامہ پہنایا گیا ہے کہ نثر کرنے پر بھی کسی تبدیلی اور گھٹا بڑھا کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی، شیخ سعدی کے مقولہ ''دروغ مصلحت آمیز بہہ از راستی فتنہ انگیز'' کو کس سادگی کے ساتھ شعر میں ڈھالا ہے۔

جھوٹ کہنے سے اگر آپس میں ہوجائے صلح
بات سچی اس جگہ اختر نہ لانا چاہئے

اسی غزل کا دو شعر اور لکھنے کو جی چاہتا ہے جو عصری حسیت سے بھرپور ہے اور جس میں اختر مظاہری کے درد وکرب کا پورا اظہار ہے۔

بھوک سے تڑپے ہیں بچے آپ چھلکاتے ہیں جام
مے کدوں میں دوستو کیا اب بھی جانا چاہئے

اپنی ہی بھوک مٹانا نہیں ہے کوئی کمال
دوسروں کو بھی کھلاؤ گے تو راحت ہوگی

انہیں شکایت ہے کہ۔

حق کی اب پہچان کہاں ہے
پہلا سا انسان کہاں ہے

ان کی ایک نظم میرا دیش ہے، اس میں انہوں نے دیش کی حالت زار کو موضوع بحث بنایا ہے، انہوں نے مفت خوری کو برائی نہ جاننے اور رشوت کے دور دورہ پر تنقید کی ہے، حکومت نے مرد وعورت کے مساوات کے نعرے سے متاثر ہو کر جو ففٹی ففٹی کا معاملہ کر دیا ہے، اس پر ان کا ایک چبھتا ہوا بند دیکھیے۔

ناری روڈ پر لے انگڑائی
ہے نہ اس میں کوئی برائی
دونوں کا حق ففٹی ففٹی
عورت مرد ہے ایک سمان
میرا دیش مہان ....

زمانے کے اطوار کس طرح بدلتے جا رہے ہیں اور اس کے اثرات لوگوں پر کس طرح پڑ رہے ہیں اس کا گلہ کرتے ہوئے اختر کہتے ہیں۔

کس پر کروں بھروسہ، کس کو کہوں میں اچھا
کہتے زباں سے کچھ ہیں، رکھتے ہیں کچھ وہ من میں
اختر بھی کر رہے ہیں اب احترام ان کا
آیا ہے نام جن کا سو لاکھ کے غبن میں

ملک کے جو حالات ہو گئے ہیں اور انسان جس طرح خوف ودہشت میں جی رہا ہے اور دوسرے کے جلتے ہوئے مکان کا تماشائی بن کر بے حس جس طرح کھڑا رہتا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

آتے ہیں پڑھ کے بچے تو یہ پوچھتے ہیں باپ
کالج میں کوئی بم کا دھماکا تو نہیں تھا

جلتے ہوئے مکان کو سب دیکھتے رہے
گلیوں میں کوئی اور تماشہ تو نہیں تھا

آخری مصرعے میں حیرت ہے، استعجاب ہے، شاعر کو لگتا ہے کہ انسان اتنا بے حس کیسے ہو سکتا ہے کہ جلتے ہوئے مکان کا خاموش تماشائی بنا رہے، اس لیے وہ اس کی توجیہہ کرتا ہے کہ شاید گلیوں میں کوئی اور تماشہ رہا ہوگا جس کے دیکھنے میں لوگ مگن رہے ہوں گے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے پاس دھڑکتا ہوا دل نہیں ہے اور جمالیاتی حس ختم ہو گئی ہے، ان کی غزلوں میں رومانی اشعار کی بھی کمی نہیں ہے۔

اپنی قربت سے دور مت رکھنا
لطف آتا ہے مجھ کو جینے میں
جام کس نے بڑھایا بتلاؤ
آج آیا ہے لطف پینے میں
معذرت خواہ ہوں ہوئی ہے دیر
چاک دامن کو اپنے سینے میں

لیکن لوٹ کر پھر وہیں پر آتے ہیں۔

آؤ نفرت کی توڑ دیں دیوار
لطف باہم ہے مل کے جینے میں

اختر بنیادی طور پر عالم دین ہیں؛ اس لیے وہ اسلامی تعلیمات کو فراموش نہیں کرتے اور قرآن واحادیث کے معنی ومطالب کو بڑے شوق سے نظم کرتے ہیں۔

سچ تلخ گھونٹ ہے مگر پی جاؤ شوق سے
سچا جو آدمی ہے وہی باوقار ہے
افلاس کے سبب نہ کرو قتل طفل کو
رزاق ساری دنیا کا پروردگار ہے

اختر مظاہری انسانی قدروں پر یقین رکھتے ہیں، اور نفرت کی وادیوں میں بھی انہیں محبت کی

شمع روشن کرنے کا فن آتا ہے، وہ نہیں چاہتے کہ کسی کو تکلیف پہونچے اس کے لیے وہ کانٹوں سے راستوں کو پاک کرنے کا کام پوری لگن اور محنت سے کرتے ہیں۔

نفرت کی وادیوں میں بھی ظلمت کے باوجود
شمع محبتوں کے جلاتے رہے ہیں ہم
پہونچے کسی کو رنج یہ اختر نہیں قبول
رستے کے سارے کانٹے ہٹاتے رہے ہیں ہم

ان کاموں میں بھی انہیں عزت نفس کا پاس رہتا ہے، وہ دوسرے کے مرغ و ماہی سے اپنی روکھی سوکھی روٹی کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ایسی مجلسوں میں جانے سے روکتے ہیں، جہاں عزت باقی نہ رہے اور آدمی اپنی نظروں میں ذلیل ہو جائے۔ فرماتے ہیں۔

لقمۂ تر غیر کا اچھا نہیں
لقمۂ خشک اپنا کھانا چاہئے
جس جگہ عزت نہ ہو اہل سخن
ایسی مجلس میں نہ جانا چاہئے

بعض جگہوں پر احساس ہوتا ہے کہ اختر مظاہری کو توارد ہوا ہے مثلاً ان کی وہ غزل جس کا مطلع ہے:

تمنا صرف اتنی ہے ''انا'' بدنام ہو جائے
خرد جائے جنوں آئے کسی کا کام ہو جائے

اس میں کئی اشعار ایسے ہیں، جس میں صرف ہلکی پھلکی تبدیلی کا احساس ہوتا ہے اس کے باوجود یہ غزل مجموعے کی جان اور روح ہے۔ مجموعہ میں کئی نظمیں بھی شامل ہیں، ان میں ایک بابری مسجد کے انہدام پر ہے۔ اس نظم میں انہوں نے بابری مسجد کو ہندوستان کی امانت اور سیکولر قوم کی علامت قرار دیا ہے، اور اس المیہ کو ملک میں قیامت سے تعبیر کیا ہے اور جس طرح عدالت کو دھوکہ دیا گیا اس پر تو عدالت بھی دم بخود رہ گئی۔

رام بھگتوں کے جھوٹے وعدوں پر
دم بخود دیش کی عدالت تھی
رام کے نام پر ہو ایسا پاپ
رام کے بھگتوں کو ندامت تھی

ایک مخمس ''باڑھ میں، میں نے کیا کیا دیکھا'' کے عنوان سے ہے، جس میں بہت تفصیل سے سیلاب کی تباہ کاریاں اور ریلیف کی بندر بانٹ کا انہوں نے ذکر کیا ہے، چھوٹی بحر میں جو منظر کشی انہوں نے کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، ان میں اثر ہے، اور بیان میں سیلاب سی روانی ہے، پڑھیے اور پڑھتے چلے جائیے۔

''شہر خوبصورت'' کے عنوان سے ایک نظم میں انہوں نے فساد برپا کرنے کی تکنیک پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ پر امن ماحول کو فرقہ پرست عناصر فساد زدہ کرنے کے لیے کس طرح کام کرتے ہیں، چند اشعار دیکھتے چلیں۔

تھا شہر خوبصورت لگتا تھا جیسے مورت
تھے جو مکین اس کے ان کی حسین صورت
اک روز ایک لیڈر کہنے لگا کہ آؤ
اسکول کیمپس میں بھاشن میرا کراؤ
اقبال نے ہے مندر کی مورتی چرائی
سارے پجاریوں کو بندوق ہے دکھائی
تقریر کیا تھی اس کی نشتر چلا رہا تھا
لڑنے لڑانے کا وہ نسخہ بتا رہا تھا

اور پھر ہوا یہ کہ:

غنڈے لٹیرے آئے گھر بار سب جلائے
خنجر کہیں چلائے اور بم کہیں گرائے

نتیجہ یہ ہوا کہ:

نفرت کی آگ میں اب سب شہر جل رہا تھا
رام و رحیم دونوں آپس میں لڑ رہا تھا
وہ شہر خوبصورت خاکستر ہوگیا ہے
جو باقی بچ گیا ہے کھنڈر سا بن گیا ہے

اور ایسا اس لیے ہوا کہ سادھو سنتوں نے قتل عام کا پیغام دیا، اوما، اڈوانی اور سنگھل نے اس دنگل کا نقشہ بنایا، کہتے ہیں۔

بھارت واشی کریں گے قتل عام
سادھو سنتوں کا ہے یہی پیغام
اوما اڈوانی ہو کہ ہو سنگھل
سب کی سازش سے ہوتا ہے دنگل

شاعر اس ماحول اور ایسے پر خطر حالات سے انتہائی کبیدہ ہے، وہ بوڑھا ہو چلا ہے، ان فسادیوں اور دنگائیوں سے دو دو ہاتھ کرنا اس کے بس میں نہیں ہے، اس لیے وہ خون کے گھونٹ پی پی کر زندگی گذار رہا ہے۔

خون کے گھونٹ اب میں پیتا ہوں
ایسے ماحول میں ، میں جیتا ہوں

ایک بڑی مؤثر نظم ''جہیز کی لعنت'' پر ہے، اس میں بھی کسی شاعر سے توارد ہوا ہے، لیکن ہے بڑے کام کی، یہ نظم ایک کہانی کی شکل میں ہے، ایک پڑھی لکھی لڑکی کا باپ جب فہرست جہیز دیکھتا ہے تو سوائے زہر کھانے کے اسے کوئی حل نہیں سمجھ میں آتا، پہلے باپ مرتا ہے، پھر بیٹی بھی زہر کھا کر چلی جاتی ہے ،واقعہ الم ناک بھی ہے دردناک بھی، مولانا نبی اختر مظاہری اسے سماج کا ناسور کہتے ہیں آخری شعر ہے۔

بیٹی بہو کا جلنا تو دستور ہو گیا
تلک سماج کا ناسور ہو گیا

مجموعہ میں چند قطعات تاریخی ہیں، جن کے آخری مصرعوں سے انہوں نے تاریخ تعمیر یا تاریخ ولادت نکالنے کا کام کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابجد شماری میں بھی انہیں مہارت تھی اور وہ تاریخی اعداد پر مشتمل حروف والفاظ کا شعری پیکر دینے پر قادر تھے، ان قطعات میں ان کے دلی جذبات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے، یہ اشعار ہمیں بھی غم کا احساس دلاتے ہیں اور فرحت افزا کاموں کا ذکر ہمارے قلب میں فرحت وسرور پیدا کرتا ہے۔

اس مجموعہ میں جو رباعیات ہیں ان کی بھی اپنی اہمیت ہے، چار مصرعوں میں جو پتے کی بات وہ کہہ گیے ہیں، وہ بہت ساری طویل نظموں پر بھاری ہے۔

ترانوں میں امارت شرعیہ اور ادارہ سبیل الشرعیہ کا ترانہ اس مجموعہ کی زینت ہے، امارت شرعیہ اور اس کے اکابر نیز شعبہ جات سے جو تعلق انہیں تھا اس کی بھرپور عکاسی ان ترانوں میں ہے، مولانا انوار اللہ فلک کے ادارہ سبیل الشرعیہ کا ترانہ بھی اس ادارہ سے ان کی محبت کا مظہر ہے، ایک خیر مقدمی نظم وفاق المدارس پر بھی انہوں نے کہی تھی اور ادارہ سبیل الشرعیہ میں بین المدارس زونل اجتماع کے موقع سے خود ہی سنایا تھا، وہ نظم بھی اس مجموعہ میں شامل ہے، پڑھیے اور لطف لیجیے۔

امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب جب پوپری تشریف لائے اس موقع سے بھی آپ نے ایک نظم کہی ہے جو اس مجموعہ کی زینت ہے۔

بات طویل ہوتی چلی گئی، مختصر یہ کہ غزل ہو یا نظم، قطعات ہوں یا ترانے، سب میں ان کی اسلامی فکر، عصری حسّیت سے بھرپور ان کے خیالات، بگڑے ہوئے حالات کا ماتم اور سدھارنے کی جد وجہد کا ذکر ملتا ہے، افکار پختہ، بالیدہ اور اعلیٰ ہیں، رہ گیا فن۔ تو اس پر گفتگو کی اچھی خاصی گنجائش ہے اور کہاں نہیں ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اس مجموعہ میں بہت سارے اشعار ایسے ہیں جو فکر وفن دونوں کے اعتبار سے معیاری ہیں، اور ایسے اشعار ہی اس مجموعہ کی طباعت کا جواز فراہم کرتے ہیں اور اس مجموعہ کو علم وادب کی دنیا میں دیر تک باقی رکھیں گے، ایسی مجھے امید ہے۔

(۱۵؍جمادی الاولی ۱۴۳۳ھ- ۸؍اپریل ۲۰۱۲ء)

اعظم سلفی کی شاعری

مولانا محمد رئیس اعظم سلفی کا مجموعۂ کلام ''خیال خاطر'' زیور طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر آنے والا ہے، یہ ایک اچھا کام ہے جو ڈاکٹر محمد صباء الہدیٰ صبا نے کیا ہے، اس مجموعہ کی اشاعت سے مولانا مرحوم کا کلام زمانہ کی دست برد سے محفوظ ہو جائے گا اور قارئین اس سے محظوظ ہوتے رہیں گے۔

مولانا محمد رئیس اعظم پرانے بزرگ نہیں ہیں، مجھے ان کے ساتھ کام کرنے کی سعادت تقریباً اٹھارہ سال میسر آئی، اس طرح کہنا چاہئے کہ میں ان لوگوں میں ہوں جنھوں نے مولانا مرحوم کو قریب سے دیکھا، جانچا، پرکھا، برتا اور ان کی شاعری کو ان کی زبان اور ان کے مخصوص لب و لہجے کے ساتھ سننے کا موقع ملا، میں نے انھیں مجلس پر چھاتے اور سامعین کو لوٹ پوٹ ہوتے بھی دیکھا، اس طرح شاعر، شاعری اور پیش کش تینوں سے میرا رشتہ دور کے جلوہ کا نہیں، روزمرہ کا رہا ہے۔

مولانا شاعر تھے، لیکن زود گو اور بسیار گو نہیں تھے۔ ان کے اشعار عالم بالا سے اسی وقت وارد ہوتے تھے جب کوئی خارجی محرک ہوا کرتا تھا، محرک نہیں ہوتا تو مہینوں وہ کوئی شعر نہیں کہتے یا کہنا چاہئے کہ نہیں کہہ پاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کل شعری سرمایہ جو دستیاب ہو سکا وہ ایک دعا، چار نعت، سات غزل، نو نظم، پانچ سہرے چار ترانے دو مرثیے اور چند متفرق اشعار پر مشتمل ہے۔ ناظم جلسہ کی حیثیت سے کچھ قطعات بھی کہے، جو ان کی فی البدیہہ اور برجستہ شاعری کی اچھی مثال ہے۔ لیکن اس کا محرک وہ جلسہ کے حالات ہیں، جن کی وجہ سے شعر موزوں ہو گیا۔

مجموعہ کا آغاز دعا سے ہوتا ہے، جو شان عبدیت کے عین مطابق ہے، اور پھر نعتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، آج کل شعراء نعت، حمد، مناجات میں فرق ملحوظ نہیں رکھتے اور نبوت کے ڈانڈے الوہیت سے ملا دیتے ہیں، اس طرح صنفی اعتبار سے بھی خامی رہ جاتی ہے اور دینی شرعی اعتبار سے بھی یہ صحیح نہیں ہے۔ مولانا کی تربیت سلفیوں کے سایے میں ہوئی تھی، دار العلوم احمدیہ سلفیہ میں تعلیم پائی تھی،

اس لیے نعت کے اشعار میں ان کے یہاں اس درجہ غلو نہیں ہوتا اور نعت کہتے کہتے وہ مناجات پر نہیں آتے۔ یہ اپنے میں بڑی بات ہے، عشق نبی سے شرسار یہ اشعار دیکھتے چلیں۔

تیری ہی یاد مجھ کو جو لیل و نہار ہے
سرمایۂ سکونِ دلِ بے قرار ہے
تیرا وجود پاک ہے انسانیت کی اوج
تیرے ہی دم قدم سے یہ باغ وبہار ہے

انہیں احساس ہوتا ہے کہ نعت کے یہ اشعار شاید نبی کے شایان نہیں ہو سکے، اس لیے کہتے ہیں۔

نعتِ نبی لکھوں یہ ہماری ہے کیا مجال
جب مدح خواں حبیب کا پروردگار ہے

تیری رحمت، تیری عظمت کو کوئی کیا جانے
ہے تخیل سے پرے رتبۂ اعلیٰ تیرا

نعت کے اشعار میں جا بجا اپنے ایمانی عقیدہ کا اظہار بھی کرتے جاتے ہیں۔

اے دل نہ ہو مایوس یہ دربار نبی ہے
رحمت کی کمی ہے نہ عنایت کی کمی ہے
میرا تو عقیدہ ہے کہ وہ ہو کے رہے گی
اللہ کے محبوب نے جو بات کہی ہے
شیدا ہے خدا ان پہ خدائی بھی تصدق
کیا مرتبہ سرکار کا اللہ غنی ہے
اعظم کو فقط مدح پیمبر کی بدولت
شہرت بھی ملی ہے اسے عزت بھی ملی ہے

بعض اشعار میں غلو کا رنگ آ گیا ہے، لیکن دوسروں کی طرح نہیں۔

بار گناہ سر پہ ہے دل شرم سار ہے
لیجئے خبر حضور بہت حال زار ہے
بلوائیں گے دیارِ مقدس پہ اب حضور
اعظم کو مدتوں سے یہی انتظار ہے

کیوں کسی اور کی امداد کا محتاج رہے
تیرے اعظم کو تو کافی ہے سہارا تیرا

مجموعہ میں جو غزلیں ہیں، ان میں رومانیت کم اور فکر کے اعتبار سے ''ادب برائے زندگی'' کے خدو خال نمایاں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے جس طرح زندگی کو برتا اور جن حالات سے انہیں گزرنا پڑا، اسے انھوں نے اشعار میں ڈھال دیا ہے۔ ہے تو یہ آپ بیتی، لیکن ہر پریشان حال لوگوں کے دل کی آواز یہی ہے اس لیے ہم اسے جگ بیتی بھی کہہ سکتے ہیں۔

یہ کیسی زندگی میرے پروردگار ہے
میری حیات وقفِ غم روزگار ہے
غم ہے، الم ہے، گردشِ ایام ہے مگر
اتنے عدو ہیں ایک میرا قلب زار ہے
بہلاتا ہوں یہ کہہ کے دل بے قرار کو
جس نے یہ غم دیا ہے وہی غم گسار ہے

ان حالات میں بھی ان کی رومانی حس سو نہیں گئی ہے، سارے چرچے کے بعد کہتے ہیں۔

تعریف کیا کروں ترے حسن وجمال کی
تیغوں سے تیز جب تیری ابرو کی دھار ہے
میں نے تو کچھ بھی ایسا کسی سے کہا نہیں
یہ کس نے کہہ دیا کہ مجھے تم سے پیار ہے

مگر یہ تجاہل عارفانہ ہے، عشق ومحبت کی آگ جو دل میں لگی ہے، اس کو بجھانا آسان نہیں ہے، شاعر اسی امید پر جی رہا ہے۔

کسی دن تو دیدارِ محبوب ہوگا
چراغِ تمنا جلائے ہوئے ہیں
یہ سچ ہے محبت کا تحفہ سمجھ کر
تیرے غم کو دل سے لگائے ہوئے ہیں

اعظم سلفی کی یہ محبت بتان رنگ وبو سے بھی ہو سکتی ہے اور خالقِ کائنات سے بھی، عشق حقیقی ہو یا مجازی یہ مولانا کی رگ وپے میں سرایت کیے ہوے ہے۔ وہ ہر دم اسی کی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔

اسے مل گیا ہے خدائے دوعالم
خودی کو جو اپنی مٹائے ہوئے ہیں
تو ہی حاصل زیست ہے اس لیے ہم
ترے نام کی رٹ لگائے ہوئے ہیں

اعظم سلفی جب عشق مجازی کی طرف بڑھتے ہیں تو بھی محبوب کی بے اعتنائی پر گلے، شکوے، گریہ ونالہ آہ وبکا سے گریز کرتے ہیں، انھیں لگتا ہے کہ ایسا کرنے سے محبوب کی شکایت ہوگی، وہ حوادثات سے گھبرتا نہیں جانتے وہ اسے بزدلی اور شرم کی بات قرار دیتے ہیں کہ آدمی حوادثات سے گھبرا کر تھک ہار کر بیٹھ جائے۔ چند اشعار دیکھئے۔

ضبط غم فراق سے تنگ آ گیا تو کیا
گر رو پڑا تو اس میں شکایت ہے آپ کی
اعظم حوادثات سے گھبرا کے بیٹھنا
یہ بزدلی ہے اس میں ندامت ہے آپ کی

اعظم سلفی جب عشق مجازی کی طرف بڑھتے ہیں تو بھی محبوب کی بے اعتنائی پر گلہ وشکوہ، گریہ ونالہ، آہ وبکا سے گریز کرتے ہیں، انہیں لگتا ہے کہ ایسا کرنے سے محبوب کی شکایت ہوگی، وہ حوادثات

سے گھبرانا نہیں جانتے وہ اسے بزدلی اور شرم کی بات قرار دیتے ہیں کہ آدمی حوادثات سے گھبرا کر تھک ہار کر بیٹھ جائے، چند اشعار دیکھیے۔

ضبط غم فراق سے تنگ آ گیا تو کیا
گر رو پڑا تو اس میں شکایت ہے آپ کی
اعظم حوادثات سے گھبرا کے بیٹھنا
یہ بزدلی ہے اس میں ندامت ہے آپ کی

لیکن اعظم بھی ایک انسان ہیں، احوال سے متاثر ہونا فطری بات ہے، وہ غم سے گھبرا کر گریباں چاک تو نہیں کرتے، صحرا کو نہیں نکلتے، بہت ضبط کرتے ہیں، جب غم حد سے بڑھ جاتا ہے تو مالک حقیقی سے شکوہ کرتے ہیں جو اصلاً غم کشا ہے، کہتے ہیں۔

خدا وندا رہے گی بند یہ میری زباں کب تک
تو میرے صبر کا لیتا رہے گا امتحاں کب تک
نہ اب برداشت کی قوت ہے نہ صبر وتحمل کی
تمہارے ظلم کو سہتا رہوں اے مہرباں کب تک

اعظم سلفی کے یہاں قنوطیت نہیں، رجائیت ہے، وہ بڑے مخالف حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتے، ان کا عقیدہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے اور مایوس تو کافر ہوا کرتے ہیں، اس لیے وہ قاری کو بڑھتے رہنے کا درس دیتے ہیں، اس طرح دیکھیں تو ان کی شاعری سے ہمیں بڑا حوصلہ ملتا ہے۔

یہ شان وشوکت یہ جاہ وعزت ملا کیے ہیں چھنا کیے ہیں
سمجھ سے کام لو ہم نشینو کسی کا ساتھی زماں نہیں ہے
تمہارا یہ اضطراب تم کو کہیں نہ لے ڈوبے اہل گلشن
خزاں جسے تو سمجھ رہا ہے وہ در حقیقت خزاں نہیں ہے

ہے عزم راسخ تو کھیلتا جا یہ زور طوفان کیا کرے گا
سفینہ ساحل سے جا لگے گا بلا سے گر بادباں نہیں ہے

اعظم چاہتے ہیں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا نہ جائے بلکہ پوری ہمت وجرأت کے ساتھ طوفان خیز موجوں سے ٹکرایا جائے اور گلوں کی بے حرمتی پر دستور چمن توڑ ڈالا جائے۔

الجھنا ہی پڑے گا ہم کو طوفاں خیز موجوں سے
کہ طوفانوں کی ہم سے خود سری دیکھی نہیں جاتی
یہ دستور چمن اک روز ہم کو توڑنا ہوگا
گلوں کی اس طرح بے حرمتی دیکھی نہیں جاتی

مجموعہ میں جو نظمیں ہیں ان میں سب سے مؤثر نظم "قوم مسلم سے خطاب" ہے، اس میں انہوں نے امت مسلمہ کو اس کا منصب یاد دلایا ہے، موجودہ حالات کا ماتم کیا ہے اور پھر اللہ سے دعا کیا ہے کہ وہ اسے خواب غفلت سے بیدار کر دے، کہتے ہیں۔

اے خدا اس کو ہوشیار کردے
خواب غفلت سے بیدار کردے
پھر صحیح اس کا کردار کردے
جام وحدت سے سر شار کردے
قوم مسلم کو کیا ہو گیا ہے
اس کا جوہر کہاں کھو گیا ہے
قوم سوئی ہے اس کو جگائیں
اس کی تاریخ اس کو بتائیں
راہ سیدھی اسے پھر دکھائیں
وعظ منظوم اعظم سنائیں
قوم مسلم کو کیا ہو گیا ہے
اس کا جوہر کہاں کھو گیا ہے

جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا کہ مولانا کی شاعری خارجی محرکات کی رہین منت ہے اور خارجی محرکات میں سب سے زیادہ تقاضہ شادی کے موقعوں سے سہرا نگاری کا ہوتا ہے، اس مجموعہ میں بہت سارے سہرے شامل ہیں، ان میں غالب وذوق کا رنگ ڈھونڈھنا زیادتی ہوگی، پہلے سہرے فنی لحاظ سے کہے جاتے تھے، ان میں ناموں کی بھرمار نہیں ہوتی تھی لیکن اب سہرے اس لئے کہے جاتے ہیں کہ دونوں فریق یعنی دولہا دلہن کے رشتہ داروں کے درجن بھر نام اس میں ڈالے جائیں، مقصد داد وتحسین ہوتا ہے، واہ واہ کی شکل میں بھی اور داد ودہش کی شکل میں بھی، اس طرز عمل کی وجہ سے سہرا نگاری کے فن کو بڑا نقصان پہونچا ہے، نہ فکر کی بلندی کا خیال رہتا ہے اور نہ فن کی پاسداری کا، اعظم سلفی کے یہاں بھی یہی کچھ ہوا ہے، پھر بھی بعض اشعار بہت اچھے نکالے ہیں۔

کتاب زندگی کی ترجمانی اس کی کلیوں میں
حیات پُر مسرت کی طرف اقدام ہے سہرا
گلے آپس میں مل مل کے جو غنچے مسکراتے ہیں
پس پردہ محبت کا حسیں پیغام ہے سہرا

مجوعہ میں شامل سہرے اور بہت ساری نظموں میں خاص کر جو استقبالیہ کے طور پر لکھے گیے ہیں، بہت تکرار ہے اور دو چار الفاظ کے الٹ پھیر کے ساتھ کئی اشعار اور مطلعے اس مجموعہ میں شامل ہیں، اسے آپ مولانا کا کمال کہہ سکتے ہیں کہ تھوڑی بہت تبدیلی کے بعد وہ مطلع، اشعار اور مقطع کو حسب حال بنا لیتے تھے؛ لیکن دوسری طرف پڑھنے والے کو یکسانیت کا احساس ہوتا ہے اور خیال آتا ہے کہ اگر مولانا نے فکر وخیال کو مہمیز کیا ہوتا اور سہل پسندی سے کام نہ لیتے تو اور بھی اچھے اشعار کی تخلیق ہو سکتی تھی۔

مجموعہ میں شامل ترانے مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور کی محبت میں ڈوب کر انہوں نے کہے ہیں، ان میں بھی ناموں کا ذکر ہے؛ لیکن یہ ذوق سلیم پر بار نہیں ہوتے ان ترانوں میں جدت ہے، ندرت ہے، تاریخ ہے، پیغام ہے اور مدرسہ کو آگے بڑھانے کا عزم ہے، حوصلہ ہے۔

دو مرثیے بھی شامل کتاب ہیں، ایک جناب انوار احمد صاحب کی موت پر اور ایک والدہ کی جدائی پر، ''آہ مادر مہربان'' کے عنوان سے لکھی گئی یہ نظم انتہائی مؤثر ہے، اس کو پڑھ کر بے اختیار آنکھوں

سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، اس مرثیہ کے کئی اشعار میں توارد کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس کے باوجود اس میں جو سوز وگداز ہے، واقعہ نگاری ہے، وہ اس کو دوسروں کے مرثیے سے ممتاز کرتی ہے۔

ہو گیا مجھ پہ عیاں اب تیرے مرجانے سے
حشر ہوتا ہے بپا ماں کے گذر جانے سے
تو غریبوں کی تھی ہمدرد ، یتیموں کی شفیق
غم زدہ ہو گیے سب تیرے بچھڑ جانے سے
گور مادر کی طرف دل لیے جاتا ہے ہمیں
شاید آجائے قرار آج ادھر جانے سے

مختصر یہ کہ ''خیال خاطر'' ایک اچھا مجموعۂ کلام ہے، جو تنہائی کا رفیق بن سکتا ہے، اس کے بہت سارے اشعار میں ہمارے لئے پیغام ہے، سہل اور سادہ انداز میں کہے گئے یہ اشعار ہمارے دلوں پر دستک دیتے ہیں، رمزیت اور ایمائیت سے بڑی حد تک خالی ان اشعار کو سمجھنے کے لیے ہمیں ذہن پر بوجھ نہیں ڈالنا پڑتا، ہمیں لگتا کہ شاعر نے جو کہا ہے وہ ہمارے دل کی آواز ہے، اور دل کی آواز بن جانے والی شاعری دیر تک زندہ رہتی ہے، مجھے امید ہے کہ ''خیال خاطر'' کے مشمولات ہمارے دل ودماغ میں اچھی شاعری کے حوالے سے زندہ رہیں گے۔

(۲۹/ذیقعدہ۱۴۳۳ھ-۱۷/۱اکتوبر۲۰۱۲ء)

انوارالحسن وسطوی کی رشحات قلم

مہینوں بیت گیے جب نامور قلم کار، صحافی، بافیض استاذ، مشہور تبصرہ اور تنقید نگار نیز اردو تحریک کے علم بردار بلکہ بقول حالی مستقبل کے میر کارواں جناب انوارالحسن وسطوی کی کتاب ''رشحات قلم'' منظر عام پر آئی تھی، خواہش اجراء کی تقریب میں شرکت کی بھی تھی اور کچھ لکھنے کی بھی، شرکت تو اس لیےنہیں ہوسکی کہ اجراء کی تاریخ بالآخر وہ طے پائی، جس دن اور جس وقت امارت شرعیہ کی مجلس شوریٰ کی میٹنگ تھی، خیال آیا کہ جہاں بڑے بڑے علماء، ادباء، صحافی اور نقاد شریک ہورہے ہیں، اس میں علم وادب کے ایک طالب علم بلکہ طفلک کی غیر حاضری کا نوٹس کون لے گا اور کیوں لے گا؟ پروگرام کے اختتام کے بعد کئی فون آئے، جس میں تقریب سے غیر حاضری کا شکوہ تھا، دُہائی اس تعلق کی بھی دی جارہی تھی جو محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کو انوارالحسن صاحب سے رہی ہے اور ہے، میں نے درج بالا خیالات کا اظہار ان کے سامنے بھی کر دیا، کہنے لگے، حضور آپ کی بات سچ مان لیں تو بھی بچوں کے رونے گانے اور ہنسنے کا بھی ایک رنگ وآہنگ ہوتا ہے، کچے گانے کے شائقین تو اس میں بھی تال سُر نکالتے رہتے ہیں، شکوہ اس کا ہے کہ آپ نے غیر حاضر ہو کر ہم لوگوں کو ان سب سے محروم کر دیا۔

بات آئی گئی ہوگئی، کتاب مطالعہ کی میز پر رکھی رہی، تا کہ نہ نگاہوں سے اوجھل ہو اور نہ دل سے، دماغ تیار ہوجائے تو کچھ لکھ دوں، لیکن اجراء کے بعد سے کتاب پر کئی تبصرے اور مضامین اشاعت پذیر ہوئے کہ میں پھر ساحل کا تماشائی بن گیا، انوارالحسن صاحب کی مقبولیت اور ان کی محبت کی بات تھی کہ لکھنے والوں کی ہور لگی ہوئی تھی، مجھے اس ہور میں شامل ہوتے ڈر لگ رہا تھا، آپ اسے احساس کم تری سے تعبیر کر سکتے ہیں؛ بالکل آپ حق بجانب ہیں، اس لیے کہ احساس برتری تو اللہ کے فضل سے کبھی نہیں رہی۔

اب جب کہ زمانی فاصلہ طویل ہوگیا ہے، قلم کاغذ لے کر بیٹھا ہوں کہ اس قرض کو اتار ہی دینا چاہیے، بڑوں نے کہا ہے کہ فرض اور قرض کو ہلکا نہیں سمجھنا چاہئے؛ اس قافیہ میں شامل مرض بھی ہے؛

لیکن اس کے بارے میں کیا لکھوں؛ اس کی مار اپنی جان پر پڑتی ہے، اس لئے سہل پسندی اور ہلکا پن کے ساتھ اسے ٹالتا رہتا ہوں۔

انوارالحسن صاحب نے اس کتاب کا نام ''رشحات قلم'' رکھا ہے، رشحات عربی کا لفظ ہے، چھینٹوں کے معنی میں مستعمل ہے، اسی لئے ہلکی پھوار کو ترشح کہتے ہیں، اور تھوڑا بہت برتن سے ٹپکے تو اسے بھی ترشح سے تعبیر کرتے ہیں، یہ وسطوی صاحب کی تواضع ہے کہ انہوں نے اپنے مضامین کے مجموعے کو جس میں موسلا دھار علمی ادبی بارش ہورہی ہے؛ ترشح سے تعبیر کیا ہے، تعلّی اور تکبر کے اس دور میں یہ طرز عمل قابل تعریف بھی ہے اور لائق تقلید بھی۔

کتاب کے شروع میں ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کا وقیع مقدمہ ہے، پروفیسر علیم اللہ حالی نے کتاب سے متعلق اچھے تاثرات کا اظہار کیا ہے قمر اعظم ہاشمی کا حرفے چند، مختصر لیکن بلیغ ہے، اور انوارالحسن وسطوی کا ''بیان اپنا'' تذکرہ بھی ہے سوانح بھی اور ویشالی میں اردو تحریک کی تاریخ بھی، شکریہ کے لیے جن حضرات کے نام پیش کیے گیے ہیں ان کی حیثیت بھی اردو تحریک کے حوالہ سے تاریخی ہے اور وسطوی صاحب کی اعلیٰ ظرفی: بلکہ وسیع الظرفی کا بیّن ثبوت، مجموعی طور پر یہ حصہ وسطوی صاحب کی ادبی زندگی کا ایسا مرقع پیش کرتا ہے، جس میں ان کی زندگی اور ان کی خدمات سے متعلق اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

''انوارالحسن وسطوی نے اپنے مطالعہ کا دائرہ رفتہ رفتہ وسیع کیا ہے، وہ اخبارات اور ہلکی پھلکی کتابوں کی دنیا سے نکل کر شعر وادب اور سنجیدہ علمی ومذہبی کتابوں کے مطالعہ تک پہونچے، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے انتہائی محنت اور شوق سے اپنے اندر لکھنے کی صلاحیت کو پروان چڑھایا، انہوں نے اپنی تحریریں اخباروں اور رسالوں میں شائع کرائیں اور سیمیناروں میں اپنے مضامین پڑھے، اس طرح ان کو اپنے اوپر اعتماد (Confidence) پیدا ہوا، انوارالحسن وسطوی اب ایک پختہ کار اور مشاق نثر نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔'' (ص ۱۱)

قومی ملی قائدین اور اسلاف کے ساتھ وسطوی صاحب کا جو حسن سلوک رہا ہے، اس کا تجزیہ کرتے ہوئے علیم اللہ حالی لکھتے ہیں:

''جناب وسطوی اگر ایک طرف ماضی قریب کی ایک تہذیبی وثقافتی تاریخ کی ترتیب کا کام

انجام دے رہے ہیں تو دوسری طرف ان قدروں کی حفاظت بھی کر رہے ہیں، جو آج بھی ہمارے لیے اہمیت رکھتی ہیں۔''

علیم اللہ حالی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ''تنقید ان کے یہاں دل دہی کا کام کرتی ہے، دل آزاری کا نہیں ان معنوں میں ان کا تنقیدی رویہ معروضی (Objective) کے بجائے موضوعی (Subjective) ہو جاتا ہے۔ جناب انوار الحسن وسطوی کی تنقیدی و تبصراتی تحریریں اسی لیے دل نشیں اور پر اثر معلوم ہوتی ہیں کہ ان سے اشخاص اور ان کے کارناموں کا شفاف، راست اور بے ریا جائزہ سامنے آجاتا ہے''۔

انوار الحسن وسطوی کے مضامین و مقالات جو خوبیاں ہیں بقول قمر اعظم ہاشمی:

''عصری مسائل کا شعور، معاملہ فہمی، گرد و پیش کے حالات سے باخبری، احساس و مشاہدہ میں خلوص، صدق بیانی کے ساتھ ان کا صاف و سادہ اظہار، ان تمام مضامین میں اقدار مشترک کے طور پر موجود ہیں، عبارت آرائی میں کہیں پر کوئی پیچیدگی یا ژولیدہ بیانی نہیں ملتی۔'' (ص ۱۶)

ان تحریروں سے ایک طرف رشحات قلم کی اہمیت وسطوی صاحب کی ادبی عظمت وقعت کا ادراک ہوتا ہے تو دوسری طرف قاری کا ذہن ان تحریروں کو پڑھ کر پورے طور پر ان مضامین کے دروبست تک پہونچنے کو تیار ہو جاتا ہے جسے وسطوی صاحب نے خوان یغماں کے طور پر ہمارے لیے تیار کیا ہے، کتاب میں تین قسم کے مضامین ہیں، ایک شخصیت کے حوالہ سے، دوسری کتابوں کے حوالہ سے اور تیسری قسم ان مضامین کی ہے جو اردو کے مستقبل اور مسائل کے حوالے سے قلم بند کیے گیے ہیں، شخصیت کے حوالہ سے جو مضامین لکھے گیے ہیں، ان میں خاصہ تنوع ہے، علماء بھی ہیں، مجاہدین آزادی بھی، شعراء بھی ہیں، ادبا بھی، نقاد بھی ہیں اور محقق بھی، صحافی بھی ہیں اور مزاح نگار بھی، تبصروں کے باب میں بھی اس تنوع کو برقرار رکھا گیا ہے، شعر و ادب، تنقیح و تشریح، خاکے انشائیے، تاریخ، سوانح ''آپ بیتی'' بلکہ ''مطالعہ سے آگے تک'' پر وسطوی صاحب نے دل کھول کر لکھا ہے اور بھر پور لکھا ہے، شخصیت سے متعلق مضامین میں حیات و خدمات دونوں زیر بحث آئے ہیں؛ جبکہ کتابوں پر تبصرہ کرتے وقت مصنف اور مؤلف سے متعارف کرانے کا کام بھی وسطوی صاحب نے انجام دیا ہے، اس طرح دیکھیں تو یہ مضامین ایک ہی سکے کے دو رخ معلوم ہوتے ہیں، شخصیت

اور تبصروں پر مشتمل مضامین کے درمیان تین مضامین ہندوستان میں اردو کے مسائل، مستقبل اور اردو سے بے وفائی کے اسباب پر ہیں۔ اٹھائیس شخصیتوں اور بارہ کتابوں پر وسطوی صاحب نے جو لکھا ہے وہ ان کے وسعت مطالعہ کا عکاس ہے، ان میں معلومات بھی ہے اور تحقیق بھی، ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہے اور اتنا مکمل کہ قاری کو کسی درجہ میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا، زبان سادہ پر اثر اور اسلوب بیانیہ ہے۔ کتاب کا انتساب نانا سید نور الحسن مرحوم اور دادا محبوب حسن مرحوم کے نام کیا گیا ہے؛ جو اپنے بزرگوں کے تئیں عقیدت مندی کا مظہر ہے، فلو پی پر سید عبد الرافع، پروفیسر عبد القوی دسنوی اور ثناء الہدیٰ قاسمی کی تحریروں کو جگہ دی گئی ہے جبکہ ٹائٹل کے آخری سرورق پر وسطوی صاحب کی دیدہ زیب تصویر عینک کے اندر سے کچھ دیکھتی آنکھوں اور مفکرانہ خد و خال کے ساتھ موجود ہے، تصویر اتنی پیاری ہے کہ روتا بچہ دیکھ کر بہل جائے اور پڑھے لکھے لوگوں پر مفکرانہ رعب طاری ہو جائے، تصویر کے نیچے مانک ٹالا، ممبئی کے خیالات ہیں، جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''موصوف کی ان تحریروں میں جگہ بہ جگہ کلاسیکی ادب اور جدید ادب کے مطالعہ کا نچوڑ ملتا ہے اور کہیں بھی یک رنگی کا احساس نہیں ہوتا؛ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مطلع ادب پر ایک ست رنگی خوبصورت دھنک پھیلی ہوئی ہے'' مجموعہ میں ایک مضمون مانک ٹالا پر بھی ہے، جس کا عنوان ہے ''مانک ٹالا اردو ادب میں گراں مایہ سرمایہ'' اگر میں اس مضمون کو لکھتا تو عنوان رکھتا، مانک ٹالا: اردو ادب کا گراں مایہ سرمایہ''

دو سو سینتالیس صفحات پر مشتمل اس کتاب کو الھدیٰ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیر ٹرسٹ حاجی پور نے بہار اردو اکیڈمی کے تعاون سے شائع کی ہے۔ مختصر وقت میں اس ٹرسٹ نے اہم کتابیں علمی دنیا کو دی ہیں، اور معیاری طباعت کے لیے اس کا نام بازار میں کافی سمجھا جا رہا ہے۔ کتاب کی قیمت دو سو روپے ہے، یعنی ایک روپے صفحہ سے بھی کم صرف اسی پیسے صفحہ ہے، ہارڈ جلد اور ڈبل ٹائٹل بالکل مفت، خرید کر نہیں پڑھیے گا تو افسوس رہ جائے گا۔

''بے ترتیب''__ تعارف وتجزیہ

فرد الحسن فرؔد کا مجموعہ کلام میرے پیش نظر ہے، ۱۲۰ صفحات پر مشتمل ''بے ترتیب'' کے ۳۵ صفحات (ایک چوتھائی سے زیادہ) میں، انتساب اشاریہ، قصۂ بے چارگی کے بیان اور پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر علیم اللہ حالی، شمیم فاروقی، شان الرحمٰن، ڈاکٹر احمد بدر، ڈاکٹر سید رضاء اللہ اور ڈاکٹر توقیر عالم توقیر کے مضامین مختلف عنوانات سے فرؔد کی شخصیت اور ان کی شاعری پر شامل کئے گئے ہیں انتساب، کھوئے ہوئے بھائی افتخار الحسن موہن کے نام ہے اور بہت سارے اشعار میں بھائی کے بچھڑنے کا ذکر مؤثر انداز میں کیا گیا ہے۔ صفحہ ۳۶ سے ۳۹ تک حمد اور چالیس سے تینتالیس تک آقا ومولا فخر موجودات سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں نعت پاک کو شامل کیا گیا ہے۔ حمد کی تعداد تین اور نعت پاک کی چار ہے، جس کے کئی اشعار نعت سے زیادہ مناجات معلوم ہوتے ہیں، صفحہ چوالیس سے غزلیات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، جو ایک سو سترہ صفحات تک دراز ہے، مجموعہ کے آخری تین صفحات پر آٹھ رباعیات بھی شامل کتاب ہیں، میری سمجھ میں نہیں آیا کہ صفحہ چوالیس کے بجائے ۴۸ سے غزلیات کا عنوان کیوں لگایا گیا ہے۔

فرد الحسن فرد نے اس مجموعہ کا نام ''بے ترتیب'' رکھا ہے، تعلی، تفاخر اور بڑائی کے غیر معمولی اور غیر واقعی اظہار کے اس دور میں یہ نام فرؔد صاحب کی تواضع، انکساری اور فروتنی کو ظاہر کرتا ہے، یہ مزاج ہی بلندی تک پہونچنے کی کلید ہے۔ بلندی پر جانے کے لئے جھکنا پڑتا ہے اور نیچے آنے کے لئے اکڑنا پڑتا ہے، یہ قدرت کا فیصلہ ہے، جس کا مشاہدہ ہم ہر دن اونچی سڑک پر پیدل چلتے، سائیکل چڑھاتے اور پہاڑ چڑھتے، اترتے کرتے ہیں۔ ہمارے آقا ومولا فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کو ''**من تواضع لله رفعه الله**'' میں بیان کیا ہے۔ فرد الحسن فرؔد نے اس مجموعہ کے نام رکھنے میں جو تواضع برتی ہے، یہ ان کے بلند سے بلند تر جانے کی واضح اور روشن دلیل ہے۔

اگر یہ مولویانہ توجیہ پسند نہ آئے تو سمجھ لیجئے کہ ادب میں ایک صنف ہے، جسے لف ونشر غیر مرتب کہتے ہیں، جس طرح لف ونشر مرتب ایک صنف ہے اسی طرح غیر مرتب اور بے ترتیب ذکر کرنا بھی ایک صنف ہے، اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ''بے ترتیب'' خالص ادبی نام ہے، اور اس میں کہیں کوئی جھول اور سقم نہیں ہے۔ غزلیات کے مجموعہ کے لئے یہ نام اس لئے بھی موزوں ہے کہ غزل کا ہر شعر اپنے میں مکمل ہوتا ہے۔ دوسرے اشعار سے اس کی کوئی فکری ترتیب صنف نظم کی طرح نہیں ہوا کرتی۔

فرؔد کی شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ ہمیں متاثر کرتی ہے، وہ سیدھے سادے لفظوں کا استعمال ہے، وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کے لئے انہیں الفاظ گڑھنا نہیں پڑتا، جسے آج کل تشکیل لفظیات کے بھاری بھر کم لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا ایک دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں تخیل کی پرواز اتنی بلند نہیں ہے کہ الفاظ کی تنگ دامانی کے لئے انہیں شکوہ سنج ہونا پڑے، فلسفیانہ خیالات اور ادق مضامین ان کے یہاں نہ کے برابر ہیں، ان کی شاعری ہمارے گرد و پیش کی شاعری معلوم ہوتی ہے ان کا دکھ، ان کی فرقت کی داستان، ماں سے ان کی محبت، زمانہ کے بدلتے اطوار اور طریق، تہذیب وثقافت کی ٹوٹتی طنابیں اور گرتے خیمے، خوابوں کا بکھرنا اور محبوب کا بچھڑ جانا، امید و یاس میں گذرتی زندگی، یہی سب کچھ فرد الحسن فرؔد کی طرح سماج کے ہر فرد کی کہانی ہے، کہانی اپنی ہو تو کسے بھلی نہیں معلوم ہوتی۔

فرد الحسن فرؔد کو زمانہ سے گلہ شکوہ بہت ہے، ان کے اندر حساسیت بھی بہت ہے، جس کی وجہ سے زمانے بھر کا دکھ انہیں اپنا لگتا ہے۔ وہ بھلانا چاہتے ہیں، مگر بھلا نہیں پاتے، کہتے ہیں ؎

کسی کا دکھ ہو مجھے اپنا دکھ ہی لگتا ہے
کہ ڈستا رہتا ہے مجھ کو بھی آستین کا دکھ

یہ حزن ، یہ وحشت ، یہ اداسی ، یہ خموشی
میں کب سے وہی لمحہ بھلانے میں لگا ہوں

میں نہیں میؔر مگر میؔر سی حالت ہے حسؔن
''درد وغم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا''

اس کے باوجود فرؔد، یاس کے شکار نہیں ہیں، ان کے یہاں عزم ہے اور وہ پوری طرح حالات کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں، کہتے ہیں۔

مضطرب آنکھوں کو دریا نہیں ہونے دیں گے
زندگی ہم تجھے رسوا نہیں ہونے دیں گے

آج تک جو بھی بزرگوں سے ملا ہے ہم کو
منتشر ہم وہ اثاثہ نہیں ہونے دیں گے

فرؔد کے نزدیک وہ اثاثہ اعلیٰ انسانی اخلاقی قدریں ہیں، وہ ان لوگوں کو خصوصیت سے یاد کرتے ہیں جو ان قدروں کے امین تھے۔

جو دشمنوں کو بھی اونچا مقام دیتے تھے
وہ لوگ کیا تھے ، بھلا ان کی چاہتیں کیسی

فرد الحسن فرؔد سماج کے بدلتے رنگ وآہنگ اور طور طریق سے بھی پریشان ہیں، انکا بچپن پرانی قدروں کے درمیان گذرا، جہاں دادی ماں قصے سنایا کرتی تھیں اور فاقہ وافلاس کو پان کھا کر چھپایا جاتا تھا، ظاہر ہے اب ہمارے بچوں کا بچپن ٹی وی اور وی سی آر کے درمیان گذرتا ہے، نہ دادی ماں کو قصہ سنانے کی فرصت اور نہ بچوں میں قصہ سننے کی خواہش اور للک، سب کچھ بدل گیا ہے، اور جو بچ گیا ہے، وہ بھی تیزی سے بدلتا جارہا ہے، کہتے ہیں۔

اب احترام ہے لازم بدلتی دنیا کا
فقیہ شہر بھی یارو یہاں ہے بے ترتیب
سنا ہے اس کی گلی بھی ہے ان دنوں ویراں
سنا ہے اس کا بھی اب آستاں ہے بے ترتیب
وہ جس کے دم سے حیا کا چراغ روشن تھا
خود اپنے بچوں کو اب بے لباس کر تا ہے

منہدم یوں ہو گیا اخلاص کا گھر ایک دن
بھائیوں نے بھی الگ رہنا گوارہ کر لیا
رعب سا را لے اڑی آپس کی یہ رسہ کشی
دیکھتے ہی دیکھتے ہم بے اثر ہونے لگے

یہ اور اس قسم کے بہت سارے اشعار ایسے ہیں جن میں ایک پیغام ہے، درس ہے، فن کی کسوٹی پر بھی یہ پورا اترتے ہیں اور زندہ رہنے والے ہیں، البتہ بعض جگھوں پر فرؔد نے جو تعبیر اختیار کی ہے وہ کھٹکتی ہے، فرد کا ایک بڑا پیارا شعر ہے۔

اس مقتل معصوم کا انداز نرالا
مقتول تو مرجائے ہے قاتل کی ادا سے

اس میں مرنے سے پہلے قتل ہونے والے کو مقتول قرار دیا گیا ہے، اس کی اگر ہم نثر بنائیں تو ہوگا کہ ''قاتل کی ادا سے مقتول مرجائے ہے'' جو صحیح نہیں ہے، اگر اس شعر میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی جائے اور یہ کہا جائے کہ ''مقتول تو ہوجائے ہے قاتل کی ادا سے'' گو اس صورت میں بھی ''تو'' زائد ہی محسوس ہوتا ہے، ایسے موقع سے ''ضرورت شعری'' کا سہارا لیا جاتا ہے، حالانکہ ''ضرورت شعری'' کا مطلب ''شاعر کا عجز'' ہوا کرتا ہے، اسی طرح ایک شعر میں انہوں نے عکس کے لئے مدہم کا لفظ استعمال کیا ہے، جو غیر مستعمل ہے۔

ہم طلب گار محبت ہیں کبھی بھی مدھم
دل سے عکس رخ زیبا نہیں ہونے دیں گے

مدھم کا لفظ شمع، چراغ وغیرہ کے لئے استعمال ہوتا ہے عکس کے لئے نہیں، خود فرؔد نے دوسری جگہ عکس کے لئے دھندلا ہونا ہی استعمال کیا ہے اسی طرح ایک جگہ انہوں نے گھولتی، بولتی، رولتی کے ساتھ مولتی باندھا ہے، جو گراں معلوم ہوتا ہے۔

میری باتوں سے ہوتی ہے بہت خوش
میری باتوں کو اکثر مولتی ہے

ان چھوٹی چھوٹی فروگذاشتوں کو چھوڑ کر جن کی طرف عام قاری کا ذہن منتقل بھی

نہیں ہوتا، ''بے ترتیب'' ایک اچھا مجموعۂ کلام ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ ان کا مشق سخن جاری رہے گا اور وہ ادب وشعر کے حوالہ سے اس منزل پر پہونچیں گے، جس کی خواہش اور تمنا ہر شاعر وادیب کو ہوتی ہے، میں چاہتا تھا کہ کتاب کے شروع میں جن ماہرین نقد ونظر نے ''بے ترتیب'' پر لکھا ہے، اس کے کچھ اقتباس نقل کرکے اس مضمون کو مستند اور مدلل کردوں لیکن فرؔد صاحب کا یہ شعر یاد آ گیا اور میں نے ارادہ ترک کردیا۔

وہ شخص جس کی کوئی اپنی فکر ہے ہی نہیں
وہ نقل دوسروں کے اقتباس کرتا ہے

☆☆☆☆

حرف آرزو-ایک تعارف

''حرف آرزو'' محترم جناب وارث ریاضی (ولادت ۲/ اکتوبر ۱۹۴۹ء از روئے سند) کا مجموعہ کلام ہے، وارث ریاضی کا نام شعور کی آنکھ کھلنے کے بعد سے ہی ذہن میں محفوظ ہے، والد محترم ماسٹر محمد نورالہدیٰ رحمانی (ایم اے ڈبل، ڈپ ان ایڈ گولڈ میڈلسٹ) کی تعلیم تو انگریزی اور عصری علوم کی ہے، لیکن ذوق ہمیشہ اسلامی اور ایمانی رہا، اس لیے والد صاحب جن پرچوں اور رسائل کے خریدار تھے، ان میں معارف، برہان، مولوی، آستانہ، نقاد، دین دنیا، سیرت، تجلی، ہدی، وغیرہ پابندی سے آیا کرتے تھے، بچپن میں ان کے رنگا رنگ ٹائٹل میری کشش کا سبب ہوتے تھے، بعض پرچوں کے صفحات پر مختلف انداز کی تصویریں دھنک رنگ کا مزہ دیتی تھیں، پڑھنے اور سمجھنے کے لائق ہوا تو ان کے مضامین کا تنوع اور ہر ایک کا جداگانہ انداز دل ودماغ پر چھا گیا۔ معارف اور برہان کے تحقیقی مضامین سے طبیعت بوجھل ہوتی تو دین ودنیا کے تاریخی مضامین سے دل بہلا لیتا، ہلکے پھلکے مضامین پڑھنے ہوتے تو مولوی اور آستانہ کا مطالعہ شروع کرتا، تنقید، تحقیق ومزاح کے سنگم پر جانا ہوتا تو تجلی کو حرف آغاز سے شروع کرتا اور کھرے کھوٹے ہوتے ہوئے مسجد سے میخانے تک پہونچ جاتا، سیاسی اتھل پتھل دیکھنا ہوتا تو نقاد پر نظر ڈال لیتا؛ نہ کھیل سے دل بہلانے کی حاجت، نہ دوستوں کی مجلسوں میں ضیاع وقت کا اندیشہ۔ دلچسپی کا وافر سامان موجود۔

یاد پڑتا ہے کہ ایسے ہی ایک موقع سے جب معارف کا مطالعہ کررہا تھا تو اس کے ادبی حصہ پر آلم مظفرنگری اور وارثؔ ریاضی کے کلام پر نظر پڑی تھی، آلم مظفرنگری جب تک حیات تھے معارف میں پابندی سے چھپتے رہے، وارثؔ ریاضی نے ان کے انتقال کے بعد ان کی جگہ لے لی، آلم مظفرنگری کی شاگردی کی وجہ سے یہ ان کا حق بھی بن گیا اور شاعری میں ان کا رنگ بھی در آیا۔ مولانا عمیر الصدیق ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم مدیر معارف تھے، ان کے علم وفضل میں ان کی سخن فہمی کا

اعتراف زمانہ کو رہا، انہوں نے وارث ریاضی صاحب کے کلام کو جس تحسین سے نوازا اس کو بجا طور پر تحسین سخن شناس سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، وہ جس طرح وارثؔ ریاضی کے کلام کے منتظر رہتے اور معارف کے صفحات کی زینت بناتے تھے وہ منظر آج بھی ہمارے سامنے ہے، آہستہ آہستہ کلام وارثؔ ادبیات معارف کی گویا میراث بن گیا۔ القاب و خطابات کا زمانہ نہیں ورنہ شاعر معارف کا لقب تو وارثؔ صاحب کو ہی زیب دیتا ہے۔ (حرف چند ص ۲۴)

آلمؔ اور ماہرؔ کے علاوہ وارثؔ نے موجودہ امیر شریعت مولانا سید نظام الدین پھلواری شریف، پٹنہ (جن کو وہ معلم اول مانتے ہیں) اور مولانا قمر عثمانی دیوبند سے بھی اپنے کلام پر اصلاح لی نیز پروفیسر جگن ناتھ آزادؔ سے بھی کسب فیض کیا۔ ان کے بارے میں وارثؔ ریاضی نے لکھا ہے:

''انہوں نے میرے کلام پر باضابطہ اصلاح تو نہیں دی، لیکن وہ فن کے اسرار و رموز سے آگاہ فرماتے رہے اور میری اتنی ہمت افزائی کی کہ میرے اندر خود اعتمادی پیدا ہوگئی اور میرا کلام ہندو پاک کے معیاری رسالوں میں چھپنے لگا۔ (حرف آرزو ص ۳۴)

''حرف آرزو'' کا نثری حصہ ''پیش گفتار'' پروفیسر نذیر احمد سابق صدر شعبہ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ''رونمائی'' ناوک حمزہ پوری، ''حرفے چند'' مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی اور ''سخن ہائے گفتنی'' خود مصنف کی تحریر پر مشتمل ہے۔ صفحات کے اعتبار سے یہ تحریریں صفحہ دس سے پینتیس تک پھیلی ہوئی ہیں اور اہل علم کی فکر و فن کی قدردانی اور قرار واقعی اعتراف کی منہ بولتی تصویریں ہیں؛ مختصر بھی اور کامل بھی۔

اصل مجموعہ کلام صفحہ ۳۶ سے شروع ہوتا ہے اور حمد، نعت، منظومات، غزلیں، تاثرات غم اور رباعیات کے ذریعہ مختلف کیف و سرور، حزن و ملال، عقیدت و وارفتگی کے اظہار اور احوال زمانہ پر تبصرہ اور نصیحت کرتا ہوا دو سو چوبیس صفحہ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے، موضوعاتی اعتبار سے دیکھیں تو یہ مجموعہ دو حمد، سولہ نعتیں، گیارہ نظمیں، بیاسی غزلیں، چودہ حزنیہ تاثرات اور پینتیس رباعیات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اتنا سارا کلام والدین، استاذ اور شریک حیات کے نام مژدۂ بقاء دوام ـ ـ ـ۔

منزل دشوار

پروفیسر ڈاکٹر سید فضل اللہ قادری ان شخصیتوں میں سے ہیں، جن سے میں بے پناہ محبت کرتا ہوں اور ان کے والد مولانا سید احمد عروج قادری کے علوم، مضامین و مقالات سے استفادہ کرنے کی وجہ سے اس محبت میں اکرام و احترام، عظمت و تقدس بھی شامل ہے، قادری کا بھاری بھرکم لاحقہ بھی متعلقین کو سرنگوں ہونے پر مجبور کرتا ہے، انہوں نے جناب مرغوب آثر فاطمی کا مجموعہ کلام ''منزل دشوار،، تھمائی اور حکم دیا کہ اس پر کچھ لکھا ہے، لیکن ''منزل دشوار'' پر کچھ لکھنا دشواری میں مبتلا کرسکتا ہے،، خصوصا اس صورت میں جب کہ شاعر کا تعلق پولس محکمہ سے رہا ہو، اور ڈی ایس پی کے بھاری بھرکم عہدے سے ریٹائر ہوئے ہوں اور ٹائٹل کے آخری صفحات پر ان کی عینک پوش بڑی بڑی آنکھیں مسلسل گھور رہی ہوں تو ڈر لگنے لگتا ہے کہ کون سی بات گراں گذرے اور نہ جانے کن جملوں کو پڑھ کر ''پولسیا،، عادت لوٹ جائے اور ہم جیسے کمزور و ناتواں پر برق بن کر گرے؛ لیکن چونکہ ڈاکٹر فضل اللہ قادری صاحب درمیان میں ہیں، اس لئے ان سے ہو کر ہی کوئی قہر مجھ تک پہنچے گا اور قادری کی خفگی مول لے کر کوئی کیوں اپنی عاقبت خراب کرے گا۔

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ''منزل دشوار'' مرغوب آثر فاطمی کا مجموعہ کلام ہے جسے ادبستان پبلی کیشن دہلی نے شائع کیا ہے کمپوزنگ سید فضل الرحمٰن کی اور سرورق اظہار احمد ندیم کے تخیل کا نتیجہ اور تجریدی آرٹ کا عمدہ نمونہ ہے، اب اسے ہماری بدشوقی یا بدذوقی کہیے کہ اس آرٹ کے رموز تک میری رسائی کبھی نہیں ہو پاتی ہے، قصور آرٹسٹ کا نہیں اپنی کورمغزی کا ہے، جس کے بھیجے اس آرٹ کو سمجھنے میں ہمیشہ ناکام رہے ہیں، طبع اول ۲۰۱۲ میں ہوا ہے، تعداد اشاعت درج نہیں ہے، اچھا ہی ہے، تعداد دیکھ کر کیوں سر بازار قاری کے ذوق طلب کو رسوا کیا جائے، یہ مان لینے میں کیا برائی ہے کہ ڈی ایس پی صاحب کی کتاب ہے، اس لئے ایک ہزار سے کم کیا چھپی ہوگی، حسن ظن اسلامی طریقہ ہے اور اسے ہر حال میں ملحوظ رکھنا چاہئے، ایک سو چالیس صفحہ کی کتاب کی قیمت دو سو روپے زیادہ نہیں سمجھئے، کمپوزنگ

طباعت اور بائنڈنگ کی اجرت اور کاغذ کی قیمت آسمان چھورہی ہو تو قیمت کم کر کے جمع شدہ پونجی کو داؤ پر لگانے کی حماقت کون کر سکتا ہے۔

مجموعہ کا انتساب والد مرحوم مسعود احمد فاطمی اور والدہ مرحومہ حبیبہ خاتون کے نام کر کے مرغوب آثر فاطمی نے اس سعادت مندی کا ثبوت دیا ہے جو والدین سے فطری طور پر لڑکوں کو ہوتی ہے، مغرب سے آنے والی ہوائیں دھیرے دھیرے اس سعادت مندی کو کم کرتی جارہی ہیں، ہندستان میں بھی ''اولڈ ایج ہوم'' کا تصور پروان چڑھنے لگا ہے۔ اللہ کرے مشرق کی زندہ اور تابندہ روایت ان تیز ہواؤں سے اڑنہ سکے ،آمین کہہ لیجئے، کیوں کہ ہم لوگوں کا بڑھاپا بھی جوانی کی دہلیز پر دستک دینے لگا ہے۔

شاعر نے مجموعہ کے آغاز میں جو اشعار دیئے ہیں، اس میں ایک کمسن بچہ طنزیہ انداز میں ان سے پوچھتا ہے کہ ''شاعری سے باز نہیں آؤ گے،، ہمیں معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ کمسن بچہ شعر وادب کا کیسا پارکھ تھا جو ایک ڈی ایس پی شاعر سے ''باز آؤ گے شاعری سے نہیں'' جیسے جملے کہنے کی ہمت کرتا ہے، کم سنی میں طنز کی یہ کاٹ ہے اور تنقید کی ایسی جرات ہے تو آگے چل کر کیا کیا گل کھلائے گا، سوچنے کا مقام ہے۔

شاعر کو اقرار ہے کہ میں نوکری سے سبکدوش ضرور ہو گیا ہوں لیکن نعوذ باللہ زندگی سے سبکدوش نہیں ہوا ہوں، نعوذ باللہ کا موقع سمجھ میں نہیں آیا زندگی سے سبکدوشی پر تو موت آتی ہے کیا موت سے بھی اللہ کی پناہ چاہی جائے گی، ان اشعار کو آپ بھی دیکھئے ؎

ایک کم سن نے طنزیہ یہ کہا

باز آؤ گے شاعری سے نہیں

میں سبکدوش نوکری سے ہوا

نعوذ باللہ زندگی سے نہیں

اس کے بعد مرغوب آثر فاطمی نے ابتدائیہ میں اردو شعر وادب سے وابستگی اور شاعری کے آغاز کی کہانی شستہ نثر اور اچھے اسلوب میں لکھا ہے، احباب ورفقاء کو بھی شکریہ کے ساتھ یاد کیا ہے، جو کسی بھی طرح ان کے اس ذوق کو پروان چڑھانے میں معین ومددگار رہے ہیں یہ ایک اچھی صفت ہے، حدیث میں آیا ہے کہ جو لوگوں کا شکر ادا نہ کرے، وہ خالق کا شکر کیا ادا کرے گا، آثر فاطمی نے اپنی شاعری

کے بارے میں اس ابتدائیہ ہی میں واضح کر دیا ہے کہ انہوں نے شاعری میں نہ تو ''تنہانشینی'' کی راہ اختیار کی ہے اور نہ ''مطالعہ نفسی'' کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تصوّف کی باریکیاں اور معرفت نفس کے مراحل ان کی شاعری میں ڈھونڈھنا زیادتی ہوگی ''خطابت'' کہنے کا حق انہوں نے قاری کو دیا ہے لیکن شاعری میں خطابت کے لیے نظموں اور غزلوں کی زمین نہیں عموماً مثنوی کی صنف استعمال ہوتی رہی ہے اس لیے ''خطاب'' کہنے میں مجھ جیسے قاری کو تردد کا سامنا ہے، البتہ ان کی اس خوداعتمادی کی داد نہ دینا بے دادی ہوگی جو خداداد خاں مونس کے شعر کا سہارا لے کر انہوں نے پیش کیا ہے۔ ؎

کیا لطف تعارف میں فن کار اگر بولے ☆ معراج ہنر یہ ہے خود منہ سے ہُنر بولے

اس شعر کو پڑھ کر واقعی مزا آ گیا، اگر ابتدائیہ میں صرف اتنا ہی ہوتا، تب بھی پوری بات تک رسائی ہو جاتی، دیباچہ ڈاکٹر محمد منصور عالم کا ہے ; جو مگدھ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو اور پروفیسر بھی ہیں، دیباچہ انہوں نے اچھا لکھا ہے، اشعار بھی اچھے کوڈ کیے ہیں، دخل دور طالب علمی کی رفاقت کا بھی ہے اور تنقیدی ریاضت کا بھی، فن کی پرکھ کا شعور نہ ہو تو رفاقت کہاں کام آتی ہے، پروفیسر صاحب سے میں بہت واقف نہیں; لیکن کتاب کا دیباچہ ان کی تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار ہے اور صدر شعبہ اردو کو بصیرت نہیں ہوگی تو کسے ہوگی؟ البتہ جب سے سنیر ٹی کی بنیاد پر صدر شعبہ بننے کا ضابطہ بنا ہے اس باب میں مستثنیات ہی کا پلڑا بھاری ہے۔

اصل کتاب ص۲۰ سے شروع ہوتی ہے اور مومن بغیر مناجات کے اپنا کام شروع نہیں کرتا، سو آثر فاطمی نے بھی اس مجموعہ کا آغاز مناجات سے کیا ہے اور سب سے اونچے نکلنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے ؎

ایک ایسی اچھال دے مجھ کو

سب سے اونچا نکال دے مجھ کو

حد کو پہونچی ہے آدمی کی سوچ

اور اونچا خیال دے مجھ کو

تیری طاقت سے لکھ رہا ہوں کچھ

میرے فن میں کمال دے مجھ کو

کر نوازش اثرؔ پہ بس اتنی
ایک فکر فعال دے مجھ کو

مناجات کے بعد نظمیں شروع ہوتی ہیں، ماؤں کا المیہ، اعتدال، دروازے، مجھے مرنے دو، اردو سے مجھ کو الفت ہے، نئی آواز، کہاں جائیں، بدلتی قدریں، شکیلہ تو نہ آئی، آہ لڑکیاں، بدلتے کردار، دیر آید، زندگی کی چاہ، لمحوں کی لاش شاعری کیوں؟ کے عنوان سے نظمیں اس مجموعہ میں شامل ہیں، جن میں پانچ قید و بند سے آزاد ہیں۔

آزاد نظم ہو یا غزل پڑھنے میں مزہ نہیں آتا ممکن ہے اس میں عادت کا دخل ہو، ہمارے مشفق کرم فرما ڈاکٹر ثوبان فاروقی نے اس کو مقبول بنانے کے لیے آزاد شاعری کو مصوری بھی بنا دیا تھا اور شکل یہ نکالی تھی کہ ہر مصرعہ اس طرح لکھا جائے کہ نظم غزل کے ساتھ ایک تصویر بھی بن جائے، شاعری نہ متاثر کر سکے تو مصوری دل و دماغ کو کھینچنے کا سبب بن جائے لیکن اس کے باوجود آزاد نظم و غزل کی حیثیت قافیہ بند شاعری کے مقابلے ہمیشہ کمزور رہی، مظہر امام، علی سردار جعفری اور اختر الایمان بھی پابند نظموں میں جو مقبولیت حاصل کر سکے، آزاد میں وہ پذیرائی انہیں بھی نہیں مل سکی۔

ماؤں کا المیہ خاندانی منصوبہ بندی اور لڑکیوں کو شکم مادر میں ہی قتل کر دینے کے مضمون پر محیط ہے، اس مکروہ عمل سے جو صنفی توازن بگڑ رہا ہے، اس پر شاعر کو تشویش ہے، ان اشعار کو پڑھ کر آثر فاطمی کے کلام میں عصری حسیت کا ادراک ہوتا ہے۔

کیسے نسلوں کی ہوگی افزائش
بچے پیدا ہوں موجب خواہش
ہو طبیبوں سے جب یہ فرمائش
بڑھنے پائے نہ شرح پیدائش
دخل انساں کی انتہا ہے یہ
وقت کا ایک المیہ ہے یہ
شکم مادر میں ہی کریں پہچان
پیدا ہونے سے پہلے لے لیں جان

جھانسی کی رانیاں ہوئیں ضائع
مٹ گئیں کتنی رضیہ سلطان
غیر انسانی فیصلہ ہے یہ
وقت کا ایک المیہ ہے یہ

''شکیلہ تو نہ آئی'' کے اشعار رومانیت لیے ہوئے ہیں، لہجہ ایسا ہے جس میں تجسس ہے ایسا لگتا ہے کہ محبوبہ نے تغافل سے کام لیا ہے؛ لیکن جب ہم اس نظم کے کلائمکس پر پہونچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو جھاڑو پوچھا لگانے والی ایک لڑکی ہے، شاعر کو اس کی اہمیت کا اتنا ہی احساس ہے جتنی محبوبہ کی اہمیت ہوتی ہے، یہ آثر فاطمی کی انسان دوستی اور ملازمہ کو حقیر نہ سمجھنے کی عمدہ مثال ہے۔ اثر یہ نہ کہتے

یوں پیچ و تاب کھانے سے تھا بہتر　　اثر کر لیتے خود گھر کی صفائی

تو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کوئی ملازمہ ہے، یوں ملازمہ اور مہترانیوں تک سے عشق کرنے کے واقعات ادبی دنیا میں کم نہیں ہیں۔ نظموں کا سلسلہ ''شاعری کیوں'' پر جا کر ختم ہوتا ہے جس کا ذکر شروع کتاب میں منصور عالم صاحب نے کیا ہے، اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر دور اور ہر صنف کے شاعروں کا ذکر آ گیا ہے، آزاد نظم ہونے کی وجہ سے اسے تال و سر پر گانا تو ممکن نہیں ہوگا؛ لیکن انتہائی موثر ہے۔

شاعری کس لیے کرے کوئی/ کیا ضرورت ہے خون جلانے کی/ اس سے کس کا بھلا ہوا اب تک/ اس جہاں کو بھی کیا ملا اس سے/ اس لئے ہے یہی تو جو کوئی/ شاعری کس لیے کرے کوئی

اور یہ کہ

عمل ہی سے سلجھے گی جیون کی گتھی　　فقط شعر کہہ کہہ کہ کیا پایئے گا

نظم کے بعد غزلیں ہیں، جن کی تعداد اکہتر ہے، غزلوں میں غالب عنصر کسی کی چشم عنایت ہی کا ہے، یہ چشم عنایت ہمیشہ درد والم سے ہم کنار کرتی رہی ہے، گو اس درد کی لذت ایسی ہوتی ہے کہ لوگ زندگی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔

مجھ پر کسی کی چشم عنایت ہے آج کل　　دل آشنائے لطف و مسرت ہے آج کل
سرمایہ سکون ملے بھی تو میں نہ لوں　　اتنی عزیز درد کی لذت ہے آج کل

بس تیری یاد میں ہے شب و روز مضطرب — کیا حال ہم سنائیں دل بے قرار کا

شاعر چشم عنایت اور تصویر یار کے عکس سے باہر نہیں آنا چاہتا ہے، اسے اندیشہ ہے کہ درد عشق سے نجات مل بھی گئی تو غم روزگار سایہ فگن رہے گا۔

مل بھی گئی نجات اگر درد عشق سے — سایہ رہے گا پھر بھی غم روزگار کا

البتہ خواہش یہ ضرور ہے ۔

اب وقت ہے کہ بند ہو سرو و سمن کی بات — ہم خوب کر چکے ہیں گلوں کی، چمن کی بات
زلفوں کی لب کی بات بہت ہو چکی اثر — ہم ان سے ہٹ کے ذکر سنانے کے حق میں ہیں
بلبل کا اور گل کا بہت تذکرہ ہوا — کھیتوں کی بات کیجئے، کہیے کسان کی

اثر کے یہاں بعض مذہبی قدروں پر چوٹ بھی پایا جاتا ہے جو مناسب نہیں تھا، اکا دکا واقعات استثناء کے زمرے میں آتے ہیں، اس کو بنیاد بنا کر مذہبی قدروں کا مذاق اڑانا کسی طور درست نہیں ہے، پردہ پران کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

دل تو محفوظ تھا مضبوط حصاروں میں مگر — کوئی داخل ہوا چپکے سے لوٹ گیا
کم سنی ہی سے لگائی تھی جو دوشیزہ نقاب — لا پتہ خود ہوئی پردے کا بھرم ٹوٹ گیا

مجموعہ میں ۲۱ رباعیاں اور متفرقات میں احساسات دل، دلی جذبات، بچوں سے خطاب اور سہرا وغیرہ بھی ہے، رباعیاں مروجہ بحروں سے الگ ہیں، جس کا اعتراف خود شاعر کو ہے اور اس اعتراف کو جواز فراہم کرنے کے لئے اقبال کا سہارا لیا گیا ہے، اقبال کے حوالے کے بعد ہم جیسے لوگ خاصے مرعوب ہو جاتے ہیں، حالانکہ فکر کی بلندی کے ساتھ فن کی تکنیک پر بھی نگاہ رکھنا ضروری ہے۔ پروف محنت سے پڑھنے کے باوجود کتاب میں املا کی غلطیاں بہت در آئی ہیں تغیانی (ت سے) ص ۲۵، پاؤں کی جگہ "پانو"، ص ۲۸، فرست (سین سے) ص ۳۱ بجتے بچے کی جگہ ص ۳۳ دنیا کی جگہ دینا ص ۴۰، وغیرہ، اغلاط کی فہرست سازی مقصود نہیں، یہ ایک ہلکا سا اشارہ ہے، کتاب کی طباعت اور جلد سازی عمدہ ہے، خشک اور کھردرے پیشہ سے وابستگی کے باوجود شاعر کے لطیف جذبات قابل قدر اور ان کی پیش کش لائق تعریف ہے۔ امید ہے کہ شعر و ادب کے شائقین اس کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اپنے ذوق کی تسکین کریں گے۔

پانی اور آنسو--ایک تجزیاتی مطالعہ

حسن نواب حسن (ولادت ۱۹۴۰) بن سید خورشید نواب ایڈووکیٹ (م ۱۷/اگست ۱۹۹۲ء، بن ارشاد حسن بن چودھری ہادی بخش دبستان عظیم آباد کے ایسے گل سرسبد ہیں، جن کی شاعرانہ عظمت کے مداح شفیع مشہدی، ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر وہاب اشرفی، سلطان اختر، نقی احمد ارشاد، ڈاکٹر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد، پروفیسر حسین الحق، بہزاد فاطمی اور ڈاکٹر ظفر حمیدی جیسے اساطین علم و ادب ہیں اور رہے ہیں حسن نواب اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ان کے فن کے قدرداں ان کے معاصرین ہیں، معاصرین کی مداحی بڑی چیز ہے، اس لیے کہ تصوف کے باب میں تو معاصرت کو حجاب اکبر کہا گیا ہے، جو فن خالص اللہ کے لئے ہے، اس کا تو یہ حال ہے کہ معاصرت پہچاننے میں رکاوٹ بن جاتی ہے، ایسے میں ادب وشاعری کا کیا ذکر، یہاں تو اکثر طرم خان ہی ہوتے ہیں اور اپنے علاوہ کسی اور کی شکل کم ہی نظر آتی ہے، یہاں پر ہمیں وہ لطیفہ یاد آ رہا ہے کہ ایک شاعر کا انتقال ہو گیا، اس کے لیے ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد کیا گیا، مدعوئین میں اس شخص کا بھی نام تھا جو مرحوم کا سخت مخالف تھا، اس نے اپنی تقریر میں مرحوم کی خلاف توقع خوب تعریف کی، اور فن کے رموز ونکات سے واقفیت اور ان کی قادر الکلامی کا خوب خوب چرچا کیا اور جب تقریر ختم کیا تو کہا، میری یہ معروضات اس وقت ہیں، جب واقعتاً ان کا انتقال ہو چکا ہو، لیکن حسن نواب حسن کا معاملہ دوسرا ہے، ان کی زندگی میں ہی صاحب علم وفن ان پر تعریف کے ڈونگرے برسا رہے ہیں اور ہم جیسے لوگ سن کر اور انہیں دیکھ کر رشک کرتے ہیں کہ یہ شخص اتنے اچھے اشعار کیوں کہتا ہے، اور ایسی نکتہ آفرینی کیوں کرتا ہے کہ لوگ اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

میں نے اس مسئلہ پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ حسن نواب حسن کی فکر میں ندرت، تخیلات میں ترفع، ہیئت کی پابندی اور اوزان وقافیہ کے سانچے میں ڈھلی شاعری لوگوں کے دلوں پر دستک دیتی ہے، ان کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ ان کا ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نعروں سے دور رہنا

ہے۔ان کے موضوعات ہمارے اردگرد اور پاس کے ہوتے ہیں، کبھی کبھی تو عصری حسیت سیاسی بصیرت اور موضوعاتی آگہی کی وجہ سے ہمارے اوپر ہی وہ موضوعات چھائے ہوتے ہیں، ایسے میں ان کے اشعار ہماری اپنی آواز کی صدائے بازگشت محسوس ہوتی ہے، اور اپنی آواز کو خراب کہنے کا خطرہ تو کوئی بھی مول نہیں لے سکتا، پھر جو مسائل اس میں زیر بحث ہوتے ہیں، جو نکات اٹھائے جاتے ہیں، وہ ہماری روزمرہ زندگی سے ہی مستعار ہوتے ہیں، اس لیے وہ ہمیں جگ بیتی نہیں، آپ بیتی معلوم ہوتے ہیں، مثال کے طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے حوالہ سے ان کی مزاحیہ نظم ''نورنظر پیدا نہ ہو'' ایک لاوارث گونگی لڑکی، اف، آئی آر، شہر عظیم آباد، مختلف رنگوں کے سانپ، مسلم مخالف سازش، شناختی کارڈ، زخمی پرندہ، سوغات، صدام حسین کے نام، موت قبل زندگی، درد دل، بیٹی کا مقام، دانش ایمن اور ثنا کے نام، نیا میزائیل امن وآشتی کے لئے، آگ، ماں، پانی اور آنسو نیز پردہ جیسی نظموں کو پیش کیا جا سکتا ہے، جو قاری کو متاثر کرتی ہیں؛ حالانکہ ان میں سے کئی آزاد نظمیں ہیں، لیکن الفاظ کے در و بست اور برمحل استعمال نے ان کی اثر آفرینی کو کمزور ہونے سے، بچالیا ہے، آزاد نظموں اور غزلوں کے بارے میں میری رائے کبھی بھی بہت اچھی نہیں رہی، لیکن حسن نواب حسن کی آزاد نظموں کا معاملہ دوسرا ہے، میں نے انہیں پڑھا ہے اور ان سے بقدر ظرف مستفیض ہوا ہوں، کیونکہ ان کا اپنا ایک رنگ ہے، ایک آہنگ ہے جو مجھے پسند ہے، ان کی کئی نظموں کو پڑھ کر مجھے جوشؔ کی لفظیات اور روانی کا احساس ہوتا ہے۔البتہ جوش کی طرح ان کا لہجہ انقلابی نہیں ہے، بلکہ سبک اور دریاؤں کی روانی جیسا ہے، جو ہولے ہولے قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور جب تخلیق ختم ہوتی ہے تو آدمی ان کے سحر سے دیر میں نکل پاتا ہے۔

حسن نواب حسن کی ایک دوسری خوبی یہ ہے کہ ان کے پاس الفاظ کا ذخیرہ بہت ہے، اور جوش کی طرح الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ انہیں دوسرے معاصر شعراء کی طرح الفاظ کی تشکیل نہیں کرنی پڑتی ہے، اور ان کے یہاں نامانوس اور اجنبی الفاظ نہیں ملتے جن کے سمجھنے کے لیے ذہنی جمنا اسٹک کرنی پڑے اور معنی کی تفہیم کے لیے پس ساختیات والوں کی تشریح کا سہارا لینا پڑے۔

حسن نواب حسن نے غزلوں سے زیادہ نظمیں لکھی ہیں، اور ہمارے وقت کے نقادوں نے ان

کی نظموں کو کافی پسند کیا ہے، میں بھی ان کی بعض نظموں کا اسیر رہا ہوں، پانی اور آنسو نے مجھے کئی دنوں تک مسحور رکھا، میں نے یہ نظم خود ان کی زبانی سنا، عالمی سہارا میں پڑھا، اس اثر آفرینی میں شاعر کے تخیلات اور انداز بیان کا بڑا دخل ہے، اس کا تجزیاتی مطالعہ پرت در پرت پانی کی حقیقت کو واشگاف کرتا ہے۔گو ان کو پڑھتے وقت بار بار ان کی نظم ''پانی'' کا خیال آتا ہے اور تخیل میں تکرار کا احساس باقی رہتا ہے۔

تیس اشعار کی یہ نظم دس بند پر مشتمل ہے۔شاعر نے اس نظم میں پانی کی اہمیت، خصوصیت اور ضرورت پر شاعرانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے، پانی سے متعلق محاوروں کو پوری شاعرانہ چابک دستی اور فنی آگہی کے ساتھ نظم کیا ہے۔ اسے علم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کی زندگی پانی سے قرار دیا ہے ارشاد ربانی ہے: وَجَعَلْنَا مِنْ کُلِ شَیٔ حَی (ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی بخشی) وجود حیات کے بعد پانی کی خصوصیات حسن نواب حسن نے یہ بیان کی ہے کہ وہ مخلوق کی جان بچانے، پیاس بجھانے آغوش میں نہلانے، شانوں پر ٹہلانے، ساحل پر پہونچانے، صحرا کو گلستاں بنانے، تشنہ کاموں کی تسکین کا سامان کرنے، حالت نزع میں راحت پہونچانے کے کام آتا ہے، لیکن اسی پانی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہی پانی ہستی کو مٹانے، پیاس بڑھانے، چٹان سے ٹکرانے، فولاد کو کھانے، غرقاب کرنے، کھیتوں کو ویران کرنے، حد سے زیادہ بڑھ کر قیامت برپا کرنے، جسم میں گھٹ کر قوت کو گھٹانے، پانی پھیر کر ساری محنت کو بیکار کرنے اور شرم سے پانی پانی کرنے کی قوت وطاقت بھی رکھتا ہے اپنی اسی قوت کے بل پر جب سیلاب کا پانی امڈتا ہے تو یہی پانی آگ کا دریا ہو جاتا ہے، اور یہ روانی بجلی کی طرح ہو جاتی ہے، کہتے ہیں پانی میں کرنٹ ہے، اس پانی نے فرعون اور ان کے حواریوں کو جہاں ایک طرف غرقاب کر دیا وہیں دوسری طرف کشتی نوح کو جودی پہاڑ تک پہونچانے اور لشکر موسیٰ کو دریائے نیل سے نجات دلانے میں اس کا رول تاریخی بھی ہے اور مذہبی بھی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی کبھی مہر رب بن کر کھیتوں پر برستا ہے اور کبھی قہر بن کر ظالموں پر ٹوٹ پڑتا ہے کبھی ریگ زاروں کی تہہ سے نکل پڑتا ہے، اور کبھی پہاڑوں کے سینہ کو چاک کر کے ابل جاتا ہے، شاعر کا خیال ہے کہ نسل ابراہیمی کو اسی پانی کی بدولت ہدایت جاودانی ملی اور آب زم زم کا وہ چشمہ رواں ہوا، جس سے ساری دنیا آج تک سیراب ہو رہی ہے اور تاقیامت یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

شاعر نے پانی کی متضاد صفات وخصوصیات کو اس خوبی سے شعر میں ڈھالا ہے کہ قاری، حسن نواب حسن کے بیان کا معترف ہوجاتا ہے۔عربی میں کہا گیا ہے کہ **''تعرف الاشیاء باضدادھا''** چیزوں کی معرفت اصل اس کے اضداد سے ہوتی ہے، شاعر نے اس فارمولے کو پوری نظم میں برتا ہے اس طرح پانی کی خوبی اور اس کے ذریعہ برپا ہونے والے قہر اور نقصانات تک ہماری رسائی بآسانی ہوجاتی ہے، مختصر یہ کہ بقول شاعر

کبھی امرت تو کبھی زہر یہی پانی ہے　　کبھی رحمت تو کبھی قہر یہی پانی ہے

پانی کا ذکر کرتے کرتے شاعر کا ذہن ایک اور پانی کی طرف منتقل ہوتا ہے؛ جس سے زیادہ قیمتی پانی رب کائنات کی نظر میں کوئی نہیں ہے اس لیے یہ پانی سارے پانی سے مہنگا ہوتا ہے یہ پانی آنکھوں کے پیمانے سے چھلکتا ہے اور جذبوں کے دریا کو اشکوں کے کوزے میں سمو لیتا ہے اس قطرہ میں جو طوفان بلا خیز ہوتا ہے اس کا ادراک عقل محدود سے نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لئے تہہ تک رسائی کم یاب ہی نہیں نایاب بھی ہے۔حضرت یوسف کی جدائی میں گریۂ یعقوب، حضرت امام حسینؑ کی شہادت پر شام غریباں میں جو آنسو بہے، اس کی تہہ در تہہ گہرائیوں تک ہماری اور آپ کی عقل نارسا کا گذر نہیں ہوسکتا، اس تک رسائی کے لئے ایسے غم والم سے دوچار ہونا ضروری ہے اور جو دوچار نہیں ہوا وہ اس آنسو کی تشریح نہیں کرسکتا، جذبات کی فراوانی الفاظ کی تنگ دامانی کے ساتھ رقم نہیں کی جاسکتی ہے؛ اس لئے حسن نواب حسن کا خیال ہے کہ وہاں تک رسائی کم یاب اور نایاب دونوں ہے۔

قطرہ اشک میں طوفان بھی سیلاب بھی ہے
اس کی تہہ پانا تو کم یاب بھی نایاب بھی ہے

شاعر کا یہ اپنا خیال ہے ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جو چیز نایاب ہے وہ موجود ہی نہیں ہوتی اس لیے دونوں کو ایک ساتھ جمع کرنا صحیح نہیں معلوم ہوتا البتہ شاعر نے کہہ دیا ہے تو ہم اس کی توجیہ کرسکتے ہیں کہ بعض کے حق میں کم یاب اور بعض کے حق میں نایاب ہے، یہ ممکن ہے لیکن اس توجیہ کے لیے شعر کے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔

پانی کا ذکر کرتے ہوئے معرکۂ کرب وبلا کی طرف بھی شاعر کا ذہن منتقل ہوتا ہے اور اسے یاد آتا

ہے کہ اسی پانی کے لئے حضرت عباس کا بازو کٹا تھا اور اسی پانی کی طلب میں چھ ماہ کے معصوم اصغر کا گلا چھد گیا تھا اور مرتے دم تک شہیدوں کو پانی نہیں مل سکا تھا، پانی خود اس واقعہ پر پانی پانی ہے، اور اب بھی اسے شرمندگی کرب وبلا ہے۔

اب بھی پانی کو ہے شرمندگی کرب وبلا
بازوئے شہہ کا اسی کے لئے بازو تھا کٹا
اسی پانی کے لئے بچے لگاتے تھے صدا
اسی پانی کے لئے چھد گیا اصغر کا گلا
ظالموں کے تو ہر ایک خیمے میں پہونچا پانی
مرتے دم بھی نہ شہیدوں کو ملا تھا پانی

یہ نظم یہاں پر جاکر ختم ہوجاتی ہے، میرے پاس اس نظم کا جو نسخہ ہے اس کے نویں بند میں ایک مصرعہ ''بحر یوسف میں یہ یعقوب کی آنکھوں سے بہا''، درج ہے، یقیناً یہ بحر، ہجر ہوگا جو کمپوزر اور پروف ریڈر کی غفلت کی نتیجے میں بحر ہوگیا ہے۔ایک اور مصرعہ میں بازو کی تکرار نے تعقید معنوی پیدا کردیا ہے اور مصرعہ ذرا ہلکا ہوگیا ہے۔

بازوئے شہہ کا اسی کے لئے بازو تھا کٹا

بازوئے شہ، سے مراد حضرت عباسؓ کی ذات گرامی ہے جو اپنی جوانی، اولوالعزمی، طاقت وتوانائی کی وجہ سے حضرت امام حسینؑ کے دست وبازو تھے، شاعر ان تمام صفات کے رقم کرنے لئے ایک لفظ ''بازوئے شہہ'' استعمال کرتا ہے، یقیناً وہ حضرت امام حسینؑ کے دست راست اور اس میدان کرب وبلا میں شہ کے بازو تھے، یقینی طور پر پہلے بازوئے شہہ سے حضرت عباس مراد ہیں اور شعر میں ان کے ہی بازو کٹنے کا تذکرہ ہے، اگر یہ تکرار نہ ہو اور حضرت عباس کے لئے پہلے بازوئے شہہ کی جگہ کوئی، دوسرا لفظ ہوتا تو میرے نزدیک زیادہ بہتر ہوتا، میرے نزدیک کا لفظ میں نے شعوری طور پر استعمال کیا ہے؛ کیوں کہ ہر قاری کی اپنی حس ہوتی ہے جو پڑھتے وقت اس کے حسن وقبیح کا فیصلہ کرتی ہے، ممکن ہے نکتہ بعد الوقوع کی تفصیلات اس قبح کو حسن میں بدل دے، سلطان اختر کے ان اشعار پر اس تحریر کو ختم کرتا ہوں کہ یہی مسک الختام ہے۔

نظموں میں عیاں شعلہ بیانی اس کی
غزلوں میں منور ہے روانی اس کی
وہ کہتا ہے ارباب ادب سنتے ہیں
ہوتی ہی نہیں ختم کہانی اس کی

یہ مسائل تصوف اور تیرا بیان غالب

اسلامی تصوف میں جن نظریات نے رواج عام اور قبول تام پایا؛ ان میں ایک وحدۃ الوجود ہے اور دوسرا وحدۃ الشہود، وحدۃ الوجود کی تعبیر فارسی میں ہمہ اوست اور وحدت الشہود کی ہمہ از اوست سے کی جاتی رہی ہے، وحدت الوجود کے قائلین میں شیخ محی الدین بن عربی (م ۶۳۸ھ) کو شہرت دوام ملی انہوں نے اپنی کتاب فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم لکھ کر اپنے اس خیال کو علمی اعتبار اور فکری استناد بخشا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وجود ایک ہی ہے، مخلوق کا وجود خالق کا اور خالق کا وجود مخلوق کا وجود ہے، وہ دو مغائر موجودات کے قائل نہیں تھے، انہوں نے وجود کو صرف اللہ کے لیے ثابت کیا اور مخلوقات کے وجود کو اضافی، انتسابی اور ظلی قرار دیا، محققین کی رائے ہے کہ اس نظریہ کی جو تشریح انہوں نے کی اسے یکسر غلط نہیں کہا جا سکتا، لیکن اس نظریہ کا سہارا لے کر بعد میں خواہشات نفس کی پیروی، بوالہوسی اور اعتقادی خرابیوں کا جو طویل سلسلہ شروع ہوا اور اس ایک نظریہ کی کوکھ سے جتنے فرق باطلہ پیدا ہو گیے، اس نے اس نظریہ کو بڑا نقصان پہونچایا، ابن تیمیہ اور امام غزالی کو اس نظریہ کے مالہ وما علیہ پر گفتگو میں کافی توانائی صرف کرنی پڑی اور ابن تیمیہ کو تو جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھی جانا پڑا۔

یہاں پر ہمیں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ مغربی مفکرین جس وجودیت کی بات کرتے ہیں، وہ ایک الگ چیز ہے، وحدۃ الوجود میں سارا زور خالق کے وجود پر ہے، جبکہ مغربی مفکرین کے نزدیک وجودیت کا محور و مرکز انسان اور صرف انسان ہے، مارٹن ہائی ڈیگر (1889-1976) کا خیال ہے کہ وجود تو صرف انسان کی ذات میں ہے، جس میں شعور اور عقل ہے، یہی وجہ ہے کہ جرمنی فلسفی فریڈاک نطشے (1844-1900) نے The Gay Science میں خدائی موت کا اعلان کر دیا، جس کے نتیجے میں مغرب نے خیر وشر اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو جڑ سے اتار پھینکا، زان پال سارتر (1905-1980) نے کہا کہ درحقیقت خدا کا تصور ہی (نعوذ باللہ) تضاد (Self

(Contraditor پر مبنی ہے اور بحیثیت خالق غیر منطقی اور Inconsistent ہے، مغربی وجودی مفکرین کے یہ چند جملے صرف اس لیے نقل کیے گیے ہیں کہ جو لوگ اسلامی تصوف کے وحدۃ الوجود اور مغربی مفکرین کی وجودیت (Existent Ialism) کو ایک سمجھتے ہیں، ان پر دونوں کا فرق واضح ہو جائے۔ البتہ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موضوعاتی تسلسل کی وجہ سے ان مفکرین کو اسلامی تصوف کے وحدۃ الوجود کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اور ان حضرات نے اللہ کی جگہ انسان کو رکھ کر اس قدر استفادہ کیا کہ History of Philosophy تاریخ فلسفہ میں لکھا ہے کہ ڈی کارٹ کی کتاب Discourse on Method امام غزالی کی کتاب المنقذ من الضلال سے اتنی مشابہ ہے کہ اگر اس کتاب کا ترجمہ اس وقت آ گیا ہوتا تو اسے غزالی کی کتاب کا سرقہ کہتے۔

ادب میں مسائل تصوف کے بیان کی روایت پرانی رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تخیل میں حیرت کی آمیزش سے افکار عالیہ کا وجود ہوتا ہے، اور نظریہ وحدۃ الوجود اس کے لیے بہت مؤثر ہے، یہی وجہ ہے کہ بہت سارے شعراء نے اس نظریہ کو اپنی شعری اساس بنایا، کبھی شعوری اور کبھی لاشعوری طور پر، نظیری اور بیدل کو اس سلسلے میں مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

غالب نے بیدل کو بہت پڑھا تھا، انہیں مولانا فضل حق خیر آبادی کی صحبت نصیب ہوئی تھی، اس لیے وہ فلسفہ اور شاعری کی حد تک وحدۃ الوجود کے نظریہ سے واقف ہو گیے تھے؛ بلکہ انہوں نے اس کو اپنی نظم ونثر میں بار بار استعمال کیا، میرے خیال میں غالب شاعر تھے، فلسفی نہیں فلسفیانہ مسائل جو ان کی شاعری کا جز بنے وہ ان کی فکری ترفع کا مظہر ہیں اور یہ بحث کہ وہ فلسفی شاعر تھے یا شاعر فلسفی، لفظی موشگافیاں ہیں، جس سے ان کی شاعری کو سمجھنے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، اسی طرح وہ صوفی بھی نہیں تھے، صوفی ہونا اور چیز ہے اور صوفیانہ مضامین کو شعری قالب میں ڈھالنا بالکل دوسری چیز۔ حالی کی روایت ہے کہ جب انہوں نے اپنی غزل پڑھی اور مقطع پڑھا ۔

یہ مسائل تصوف اور ترا بیان غالب   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

تو بہادر شاہ ظفر نے کہا کہ میں تو اس وقت بھی ولی نہیں سمجھتا، غالب نے کہا کہ حضور! آپ تو اب بھی مجھے ولی سمجھتے ہیں اقرار اس لیے نہیں کرتے کہ میں عجب میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔

غالب نے اپنے اشعار میں ہستی کی جو تشریح کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وحدۃ الوجود کے قائل تھے، لیکن عملی زندگی میں انہیں اس سے کچھ لینا دینا نہیں رہا انہوں نے اس نظریے کو صرف تخیلات کی حد تک شعر کے سانچے میں ڈھالا، یہ مسائل ان کے ذہن کے نہاں خانوں میں رہے لیکن دل تک ان کی باریابی نہیں ہو سکی، خود غالبؔ نے ایک جگہ اس کا اعتراف کیا ہے، لکھتے ہیں:
’’آرائش کلام کے لیے کچھ نجوم لگا رکھا ہے، ورنہ سوائے موزونی طبع کے اور یہاں کیا رکھا ہے‘‘۔
اس مختصر مقالہ میں غالب نے وحدت الوجود کے حوالے سے جو باتیں کہی ہیں ان پر ایک نظر ڈالنی ہے، اس حوالے سے غالب کا بہت مشہور اور مقبول شعر ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسد   عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

اور یہ کہ ۔

ہے تجلی تری سامان وجود ☆ ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

ان اشعار میں غالب نے عالم کو حلقۂ دام خیال قرار دیا ہے یعنی اس کا وجود حقیقی نہیں ہے اور جو کچھ اس کائنات میں ہے اللہ کی تجلیات کا مظہر اور پرتو خورشید ہے اس طرح غالب کے نزدیک ہستی صرف اللہ کی ذات ہے انسان اور کائنات کی دیگر چیزیں حقیقت اور فنائیت کے اعتبار سے نیستی کے مرحلے میں ہیں اور ان کا وجود اعتباری، وہمی یا خیالی ہے، غالب کا ایک شعر ہے ۔

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ☆ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

یہ نیستی کا تصور ہے جس کی بنیاد پر ہستی کے سارے مضمرات اصلانفی کے مرحلے میں ہیں، اور جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہ حقیقی ہستی نہیں، فریب ہستی ہے۔ نیستی کا یہ تصور غالب کے یہاں اس قدر غالب ہے کہ لوگ جو بھی کہیں وہ ماننے کو تیار نہیں ہیں وہ اسے شاہد ہستی مطلق کی کمر مانتے ہیں، کہتے ہیں:

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے، پر ہمیں منظور نہیں

شاہد ہستی، مطلق سے مراد ذات واجب الوجود ہے، اور عالم کو کمر سے تعبیر کیا ہے جس کا وجود بھی شاعر کو موہوم ہی نظر آتا ہے، یہاں پر کسی شاعر کا یہ شعر بھی یاد رکھنا چاہیے۔

صنم سنتے ہیں تم کو بھی کمر ہے
کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

عالم کے حقیقی وجود سے انکار ہی وحدۃ الوجود کی اساس ہے اور اس نظریہ کی وجہ سے یہ کائنات اپنی حقیقت کے اعتبار سے شاعر کو نظر نہیں آتا، اس لیے لوگ چاہے اس کی ہستی کے قائل ہیں؛ لیکن غالب کو یہ منظور نہیں۔

اسی غزل کا ایک شعر یہ ہے کہ

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیِ منصور نہیں

اس شعر میں غالب نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ قطرہ حقیقت کے اعتبار سے دریا ہے اور باعتبار وجود عینیت ہے، لیکن چونکہ یہ قطرہ دریا سے الگ ہے اور اسکا وجود قطرہ کی شکل میں متعین اور مشاہد ہے اس لیے اس کی ذات مقید ہے اور اس کے لیے درست نہیں ہے کہ وہ اپنی شکل اور متعین ذات کو ہستی مطلق قرار دیدے، اس لیے کسی انسان کے لیے **انا الحق** کہنا قطعا درست نہیں کیوں کہ وہ اپنی ذات کے اعتبار سے غیر ذات باری ہے، اگر چہ وجود کے اعتبار سے انسان بھی عینیت ہے، مگر ایسا کوئی اعلان جیسا کہ منصور نے انا الحق کہہ کر کیا تھا، یہ تنک ظرفی ہے، حوصلہ اور برداشت کی کمی کا مظہر ہے، کیونکہ جب تک قطرہ غیر ذات کی شکل میں ہے وہ اپنے کو بحر سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ اس کو سہل انداز میں سمجھنا ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہاتھ کی ایک انگلی پانچوں نہیں ہے، لیکن اسے ہاتھ کی پانچوں انگلیوں سے الگ قرار نہیں دے سکتے، **لاھو ولا غیر** کے عقیدہ کی یہی بنیاد ہے۔

غالب نے اس حقیقت کو ایک دوسرے شعر میں یوں واشگاف کیا ہے۔

دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر
ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا

اس شعر میں انسان کو قطرہ اور حقیقت کو دل سے تعبیر کیا گیا ہے اور انا الحق کی تعبیر انا البحر سے کی ہے مطلب ہے کہ ہمارا مرتبہ اور حقیقت کیا پوچھتے ہو، جو وہ ہے وہی ہم ہیں، یہاں من و تو نہیں ہے

بلکہ معاملہ ''من تو شدم تو من شدی'' کا ہے

ع تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

قطرہ دریا ہی ہے صرف اس کی غیریت اس کی ذات تک محدود ہے، غیریت کا یہ پردہ ہٹے گا تو قطرے اور دریا میں مغایرت باقی نہیں رہے گی۔

بحریست متحد کہ باشکال مختلف
باران وقطرہ وصدف وگوہر آمدہ

پھر انسان چونکہ خدا کو نہیں دیکھ پاتا، اس لیے معرفت الٰہی میں اسے دشواریوں کا سامنا ہے؛ کیونکہ جو مراحل تصوف کے ہیں وہ بہت آسان نہیں ہیں ان میں طویل ریاضت درکار ہے، اس لیے سالکین اور اس راہ کے راہ رو تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں، ان میں ذوق طلب اور جستجو کی کمی نہیں، لیکن ان کے عقل کی رسائی وہاں تک نہیں ہو پاتی؛ اس لیے مجبوراً ان کی تلاش کا سلسلہ رک جاتا ہے، غالبؔ کہتے ہیں۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گیے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

غالب کی نظر میں یہ کائنات اللہ رب العزت کے جلووں کا آئینہ خانہ اور جس طرح آفتاب کی شعاعوں کے پڑنے سے شبنم کے ہر قطرہ میں آفتاب نظر آتا ہے، اسی طرح آئینہ خانہ میں روشنی ہو تو چاروں طرف کمرے میں اس کی تصویر ہی نظر آئے گی جو موجود ہے، اسی طرح کائنات ایک آئینہ خانہ ہے اس پر تجلیات ربانی نے جب ظہور کیا تو ہر چیز میں خدا ہی نظر آرہا ہے، ذرہ کا دل چیریں تو اس میں بھی خدا نظر آئے گا، لیکن یہ ہمارے فکر اور وجدان کا قصور ہے اور ہم محرم آشنائے راز دروں کے نہیں؛ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ جسے ہم حجاب سمجھتے ہیں وہ بربط کے تاروں کی طرح ہیں، جن سے خاص قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے، اگر ان رازوں کے سمجھنے کا حوصلہ ہو تو جس طرح وہ نغمے جو بربط کے تاروں سے نکل کر وجود خارجی کا اعلان کر رہے ہیں اسی طرح حجاب کے باوجود حقیقت مستور نہیں، عریاں ہے، بے حجاب ہے؛ البتہ اس کے لئے انسان کو نوا ہائے راز کا محرم ہونا ہوگا، تب یہ حقیقت اس پر کھلے گی، کیونکہ ہر حجاب پردۂ ساز یعنی خالق کائنات کے وجود پر گواہی دے رہا ہیں۔

غالب نے اس خیال کو دوسرے شعر میں بھی نظم کیا ہے، کہتے ہیں ۔

منہہ نہ کھلنے پر وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہہ پر کھلا

غالب کہنا چاہتے ہیں کہ گو ذات باری پردوں میں مستور ہے اور محبوب کے حسین چہرے پر زلفوں کا پردہ حسن کو دوبالا کرتا ہے لیکن میرے محبوب پر پڑا ہوا پردہ اسے اور بھی حسین بنا رہا ہے، ایسا حسن جو کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملتا۔ اب اگر کوئی اکتساب فیض نہیں کر پا رہا ہے اور مشاہدۂ تجلیات سے اس کی آنکھیں دور ہیں تو وہ اس کی نگاہ کا فتور ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ذرہ ذرہ روکش خورشید عالم تاب ہے اور جمال یار ہر سو جلوہ گر اور جلوہ ریز ہے ۔

کچھ نہ کی اپنے جنون نارسانے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکش خورشید عالم تاب تھا

غالب نے ان تمام مظاہر کے باوجود حق تعالیٰ کو نہ دیکھنے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ وہ وجود مطلق ہے، اس دنیائے رنگ و بو میں اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے، اس لیے کہ اسے دیکھا نہیں جا سکتا ہے کیونکہ دیکھنے کے لیے دو کا وجود ضروری ہے ایک وہ جو دیکھ رہا ہے اور دوسرا وہ جسے دیکھا جا رہا ہے۔ جب دوسرا ہے ہی نہیں تو رویت باری کس طرح ممکن ہے ۔

اسے کون دیکھ سکتا ہے کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

وحدۃ الوجود کے علاوہ غالب کے یہاں تصوف کے حوالے سے بے ثباتی عالم، تصور آخرت وموت، عبرت آموزی فنا پذیری، فنائیت، ترک تعلقات دنیوی، طلب رحمت، تلقین ترک آرزو، اخلاص، ترغیب، ایفاء، مذمت علائق دنیوی، مذمت اہل ہوس، حقیقت توحید جیسے اہم مباحث ملتے ہیں، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی نظر دوسرے امور پر بھی تھی، لیکن یہاں سب پر بحث کرنا شروع کروں تو یہ مقالہ کتاب میں بدل جائے گا اور سووینیر کے اوراق میں اس کی سمائی ممکن نہیں ہو سکے گی، اس لیے پھر کبھی، یار زندہ صحبت باقی۔

العقیدۃ الذکیۃ

اسلام کے بنیادی عقائد سے واقفیت کے بغیر مسلمان رہ کر زندگی گذارنا ممکن نہیں ہے، جتنے فرقۂ ضالہ، منحرفہ اور متحرفہ پیدا ہوئے، سب نے اسی پر طبع آزمائی کر کے اپنی الٹی سیدھی راہ نکالی اور ملت کو صراط مستقیم سے دور کیا۔ آج بھی یہ سلسلہ بڑے پیمانے پر جاری ہے اور مختلف عقائد پر اعتراض کر کے تشکیک کی فضا پیدا کی جا رہی ہے۔ ایمان اذعان ویقین کا نام ہے، جہاں تھوڑا سا شک ہوا کہ آدمی دائرے سے باہر گیا، اسی اہمیت کے پیش نظر علماء نے ہر دور میں اس موضوع پر کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے بیش تر عربی میں ہیں، اور امت مسلمہ کی بڑی تعداد اس قرآنی زبان سے ناواقفیت کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھا پاتی ہے۔ ایسی کتابوں میں امام طحاوی کی العقیدہ الطحاویہ، شاہ ولی اللہ دہلوی کی العقیدہ الحسنۃ اور مولانا ادریس ندوی نگرامی کی العقیدہ السنیۃ (جو اصلاً العقیدۃ الحسنۃ پر مفید اضافہ ہے) کا نام خاص طور سے لیا جا سکتا ہے، العقیدہ الذکیۃ اسی آخر الذکر کتاب کا سلیس اور بامحاورہ ترجمہ ہے، جو مدارس اسلامیہ کے طلبہ کی ضرورت کے پیش نظر کیا گیا ہے۔ مترجم نے مفید حواشی لکھ کر اس ترجمہ کو عام لوگوں کے لیے بھی مفید بنا دیا ہے۔ کتاب پر مقدمہ مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہری کا ہے اور تقریظ ڈاکٹر مولانا شیر افگن ندوی کی، پیش لفظ میں مترجم نے اس کتاب اور ترجمہ کی اہمیت پر گفتگو کی ہے۔ مولانا نذر الحفیظ ندوی کا مقدمہ بڑا وقیع ہے۔ پروف ریڈر توجہ دیتا تو مقدمہ میں العقیدۃ الحسنۃ کا ترجمہ اسے قرار نہیں دیا جاتا، لیکن پروف ریڈر کی چوک کی وجہ سے ایسا ہو گیا ہے، پروف کی غلطیاں اور بھی ہیں، طبع ثانی میں نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

رہنمائے قاضی

بزرگ نامور عالم دین اور قضا کے میدان میں تقریباً نصف صدی سرگرم عمل رہنے والی شخصیت حضرت مولانا محمد قاسم مظفرپوری کی تازہ تصنیف رہنمائے قاضی زیر مطالعہ ہے۔۱۳۴صفحات پر مشتمل یہ کتاب ضخامت میں کم ہونے کے باوجود اس موضوع پر وقیع اور مستند ہے۔ کتاب کو چھ مراحل پر تقسیم کیا گیا ہے، اور مرحلہ وار قاضی کے کاموں کی تفصیل اور طریقۂ کار پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، درخواست قبول کرنے سے لے کر فرد احکام، اجراء اطلاعات، سماعت مقدمات، فیصلے کی ترتیب وترسیل کے ساتھ آیات قرآنیہ واحادیث مقدسہ کی طرف بھی رہنمائی کی گئی ہے۔ صلح نامے، تصفیہ نامے اور خلع نامے کے نمونے بھی شامل کتاب ہیں۔ جس سے قاضی کو سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ کتاب کی اہمیت کے لیے خود مصنف کا نام ہی کافی تھا، لیکن حضرت مولانا نے ضروری سمجھا کہ یہ کتاب بہت سارے علماء کی نظر سے گذر جائے تاکہ کمی وکوتاہی کا ازالہ ہوسکے، چنانچہ یہ کتاب حضرت مولانا سید نظام الدین دامت برکاتہم، مولانا بدرالحسن قاسمی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا عتیق احمد بستوی، مولانا عبیداللہ اسعدی، اور مولانا قاضی عبدالجلیل قاسمی کی نظروں سے گزرنے اور ان حضرات کے مفید مشوروں کی روشنی میں حذف واضافہ کے بعد طباعت کے مراحل سے گزری ہے۔ یہ تمام حضرات، جیسا کہ پوشیدہ نہیں، قضاء کے میدان کے شہ سوار اور اس کے اصول وفروع پر گہری نظر رکھنے والے ہیں۔ کتاب ان حضرات کی تقریظات سے مزین ہے۔ اصل کتاب صفحہ ۳۹ سے شروع ہوتی ہے۔ اس طرح کہنا چاہئے کہ پانچواں حصہ اس کتاب کا تقریظات وتاثرات پر ہی مشتمل ہے۔ عمدہ کمپوزنگ، طباعت اور خوبصورت ودیدہ زیب سرورق کے ساتھ المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتا نے اسے شائع کیا ہے۔ کتاب اس لائق ہے کہ قضاء سے شغل رکھنے والے لوگ اس سے رہنمائی حاصل کریں اور تدریب قضا کے ادارے اسے اپنے یہاں داخل نصاب کریں، یہ کتاب ان طلبہ کی ضروریات کی بھی تکمیل کرتی

ہے؛ جو ابھی قضاء کی تربیت لے رہے ہیں، فاضل مصنف علمی دنیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے موضوع پر قلم اٹھایا جس سے کتب خانے خالی تھے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مصنف کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور ان کا سایہ تادیر سلامت رکھے۔ پروف ریڈنگ میں غیر معمولی احتیاط کے باوجود سرورق کے آخری صفحہ پر مصنف کا نام ''محمد قاسمی مظفرپوری'' ہوگیا ہے۔ اندر کے صفحات میں بھی چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ طباعت میں تصحیح کردی جائے گی۔

باب دوم

حرف چند

نورانی قاعدہ

قرآن کریم کا صحت کے ساتھ پڑھنا اور پڑھانا ضروریات دین میں سے ہے، تلفظ کی خرابی اور مخارج سے ادائیگی میں کوتاہی سے تلاوت کرنے والا نہ صرف گناہ گار ہوتا ہے، بلکہ بسا اوقات جو کچھ پڑھا جا رہا ہے وہ کلام الٰہی ہی باقی نہیں رہتا، اس کی وجہ سے بڑے بڑے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور کبھی نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے، فقہ میں ''زلۃ القاری'' مستقل عنوان ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ قراءت قرآن میں کس طرح کی غلطیوں سے معاملہ نماز میں فساد تک جا پہنچتا ہے۔

اسی اہمیت کے پیش نظر محی السنہ حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ نے تصحیح قرات قرآن پر خصوصی توجہ فرمائی اور مولوی نور محمد لدھیانوی کی کتاب ''نورانی قاعدہ'' کو اس کام کے لیے نہایت مفید پایا، اس پر نظر ثانی کا کام بھی کرایا، اور پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کے مکاتب و مدارس نے اسے اپنے نصاب میں داخل کیا، اس کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے بچے قرآن کریم صحت کے ساتھ پڑھنے لگے، اور قرآن کریم کی صحیح تلاوت کا نور چاروں طرف پھیل گیا۔

امارت شرعیہ کے صیغۂ تعلیم کے تحت بہار، اڑیسہ وجھارکھنڈ میں مکاتب کی بڑی تعداد ہے؛ جن میں ہزاروں طلبہ وطالبات قرآن کریم ناظرہ پڑھتے ہیں، معلمین کی تربیت کے لیے ہر سال دو تین کیمپ لگائے جاتے ہیں تاکہ ''نورانی قاعدہ'' کی تعلیم صحیح طریقے سے دی جا سکے۔

نورانی قاعدہ کی مقبولیت کی وجہ سے مختلف ناشروں نے اس نام سے مختلف انداز کی کتابیں بازار میں پھیلا رکھی ہیں؛ لیکن ان میں سے کئی طریقۂ تعلیم کے اعتبار سے مفید نہیں ہیں، اس لیے نصاب میں یکسانیت پیدا کرنے کی غرض سے اکابر امارت شرعیہ کے مشورہ اور ناظم امارت شرعیہ مولانا انیس الرحمٰن قاسمی کی ہدایت پر اسے طبع کرایا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ صیغۂ تعلیم امارت شرعیہ کی اس خدمت کو قبول فرمائے، آمین۔

(یکم محرم ۱۴۲۷ھ-۳۱/جنوری ۲۰۰۶ء)

رحمانی قاعدہ

مولانا مفتی رشید احمد قاسمی مبلغ امارت شرعیہ بہار اڑیسہ وجھارکھنڈ کا مشغلہ برسوں تک درس وتدریس رہا ہے، اس لیے قرآن کریم صحت کے ساتھ پڑھنے پڑھانے کے میدان میں ان کا تجربہ وسیع ہے، اور وہ اس کی ضرورت کو بخوبی سمجھتے ہیں، اس رسالہ کی تالیف انہوں نے اسی ضرورت کے پیش نظر کی ہے، آسان زبان میں قواعد کے اجراء کی مشق بھی انہوں نے کرائی ہے، جو کسی دوسری کتاب میں میری نظر سے نہیں گزری، اس رسالہ پر نظر ثانی کا کام جناب مولانا وقاری انور حسین قاسمی استاذ شعبۂ تحفیظ القرآن امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ نے کیا ہے۔ جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

مجھے امید ہے کہ تجوید کے بنیادی اصولوں سے واقفیت کے ساتھ یہ کتاب قرآن کریم صحت کے ساتھ پڑھنے اور پڑھانے میں مفید، معین اور مددگار ثابت ہوگی۔

وفاق المدارس الاسلامیہ کے بنیادی مقاصد میں یہ بھی ہے کہ وہ معلمین کی ایسی تربیت کا نظم کریں کہ اساتذہ متعلقہ موضوعات پر کامل دسترس کے ساتھ طلبہ کی رہنمائی کر سکیں۔ چنانچہ یہ کتاب اسی غرض سے شائع کی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کا نفع عام وتام فرمائے آمین۔

(۶/صفر ۱۴۳۰ھ)

تعلیمی نصاب برائے مکاتب قرآنیہ

بنیادی دینی تعلیم کا حصول ہر مسلمان مرد وعورت کے لیے لازم اور فرض ہے،اس کے بغیر آدمی ایمانی اور اسلامی زندگی نہیں گزار سکتا، نہ خود شناسی آئے گی نہ خدا شناسی، یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں علمائے امت نے اس کام کو ترجیحی بنیادوں پر کیا،قرآن کریم پڑھا اور پڑھایا، دین سیکھا اور سکھایا اور اس مشن میں پوری دلسوزی و دلجمعی اور خلوص کے ساتھ لگے رہے،اس کے لیے نصاب تیار کیا،ضرورت پڑی تو اساتذہ کی تربیت کا نظم کیا،غریب آبادی میں وظیفۂ معلمین کی ذمہ داری بھی نبھائی،اس طرح ہر دور میں یہ کام آگے بڑھتا رہا،تاہم اب بھی ضرورت ہے کہ اس کام کو مزید آگے بڑھایا جائے تاکہ نسل در نسل کام کا تسلسل باقی رہے۔

مولانا اسحاق کالیڑوی، قاری ممتاز احمد جامعی اور مولانا شبیر احمد قاسمی کرنالہ کو اللہ جزائے خیر دے کہ یہ حضرات پوری توجہ اور انہماک کے ساتھ دینی تعلیم گھر گھر عام کرنے کے مشن میں لگے ہوئے ہیں،اس کام کے لیے مولانا اسحاق صاحب نے تعلیمی نصاب مرتب کیا، قاری ممتاز احمد نے اس پر نظر ثانی کی اور مولانا شبیر احمد قاسمی کے زیر اہتمام طبع ہو کر یہ کتاب منظر عام پر آئی، صاحبان علم و دانش اور تشنگان علوم دینیہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا، پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا دوسرا پریس کو جا رہا ہے۔

میں نے اس نصاب کا بغور مطالعہ کیا، یہ نصاب قرآن کریم کو صحت کے ساتھ پڑھنے، نماز کے طریقے سکھانے، پاکی کے مسائل سے واقف کرانے، ادعیہ ماثورہ کو یاد کرانے اور دین کی بنیادی باتوں کو ذہن نشیں کرانے کے لیے بہت مفید ہے، مکاتب دینیہ کے ساتھ عصری علوم کے ابتدائی درجات میں بھی اس کی شمولیت مفید معلوم ہوتی ہے، ہمارا دانشور طبقہ بڑے ہی شد و مد سے یہ بات اٹھاتا رہتا ہے کہ دینی مکاتب و مدارس میں عصری علوم کو داخل کرنا چاہیے، تاکہ وہاں کے فارغین بھی دوسرے اداروں کے فارغین سے کاندھے سے کاندھا ملا کر چل سکیں، لیکن کبھی یہ بات ذہن میں ان کے نہیں آتی

کہ عصری تعلیم کے اداروں میں دینیات کو باقاعدہ شامل کیا جائے، اس لیے کہ دینی تعلیم سے ناواقفیت کی وجہ سے آخرت تباہ ہو جاتی ہے۔

میں اس اچھی کتاب کی تالیف پر اس مہم میں شریک تمام لوگوں کو مبارک باد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اس کا نفع عام و تام فرمائے اور آخرت میں اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ آمین

یارب العلمین وصلی اللہ علی النبی الکریم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

(۲۷/ ذی الحجہ ۱۴۳۱ھ)

مسجد اور اس کے پاکیزہ اثرات

روئے زمین پر اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ جگہ مسجد ہے، جہاں سے پانچ وقت توحید کی بلند و بالا آواز سماج کے ہر فرد تک پہونچتی ہے اور اسلام کی جامع دعوت اور فلاح و کامرانی کے نغمے کانوں میں رس گھولتے ہیں، کبر و غرور، فخر و نخوت سے بھرے ماحول میں اللہ کی بڑائی کا تصور عام کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کے دلوں سے اپنی بڑائی کا تصور ختم ہو جائے اور یہ احساس قلب و دماغ کا حصہ بن جائے کہ ہم سب آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ مٹی جس کی خمیر میں ہو وہ اپنی بڑائی کے صنم کس طرح بنا سکتا ہے۔

مسجد میں نماز کی جماعت قائم ہوتی ہے، جو مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کے ساتھ زندگی گذارنے اور رنگ و نسل، زبان و تہذیب سے اوپر اٹھ کر کلمہ کی بنیاد پر ایک دوسرے کو بھائی بھائی بن کر زندگی گذارنے کا سبق دیتی ہے، کسی کو کسی بنیاد پر بڑا چھوٹا نہ سمجھا جائے، ملت کی صفوں میں انتشار نہ ہو، ان کی صفیں ٹیڑھی نہ ہو تاکہ دل ٹیڑھے ہونے سے بچ جائیں۔ جس طرح مسجد میں پاک و صاف ہو کر آدمی جاتا ہے، اسی طرح پوری زندگی، جسم و جان کی پاکیزگی ہی نہیں قلب و روح کی پاکیزگی کے ساتھ گذارے اور جس طرح مسجد میں امام کی چھوٹی سی چوک پر سبحان اللہ اللہ اکبر کہنے والوں کی آواز گونجتی ہے، مسجد کے باہر بھی منکرات پر نکیر کا مزاج بن جائے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر زندگی کا مشن بن جائے۔

اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو مسجد عبادت گاہ بھی ہے تربیت گاہ بھی، خانقاہ بھی ہے درس گاہ بھی، لیکن بد قسمتی سے ہمارے معاشرہ میں مسجد کا تصور صرف عبادت گاہ تک محدود ہو گیا ہے، جس کی وجہ سے اس کی اہمیت شعائر اللہ کی رہ گئی اور وہاں سے اصلاح کی جو تحریک اٹھ سکتی تھی وہ نہیں اٹھ رہی ہے اور یہاں سے جو پیغام جمعہ وغیرہ میں دیا جاتا ہے وہ روایتی سا بن کر رہ گیا ہے۔

ہمارے عزیز دوست مولانا غلام اکبر قاسمی نے مسجد اور اس کے متعلقات پر مختصر رسالہ ’’مسجد اور

اس کے پاکیزہ اثرات‘‘ میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور اس کا کھویا مقام واپس دلانے کے لئے زبردست انداز میں اپنی بات رکھی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے امام کے مقام و منصب اور مسجد کے متولی اور سکریٹری صاحبان کے اوصاف اور ذمہ داریوں پر جرأت مندانہ انداز میں داعیانہ کردار کے ساتھ گفتگو کیا ہے۔

مولانا موصوف خود بھی پٹنہ کی مشہور مسجد مراد پور جامع مسجد کے امام ہیں اس لئے ان کا معاملہ (صاحب البیت ادری مافیہ) گھر کے بھیدی کا ہے، وہ مساجد کے پاکیزہ ماحول سے بھی پوری طرح واقف ہیں، اور اس پاکیزہ ماحول کو خراب کرنے والے داخلی و خارجی عوامل پر بھی ان کی نظر ہے، دوسرے لوگ ان حالات سے نہ تو پوری طرح واقفیت رکھتے ہیں اور نہ ہی کہنے کا حوصلہ جٹا پاتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ مولانا کی یہ کتاب پسند کی جائے گی اور مساجد کے پاکیزہ اثرات اور داعیانہ مقام و مرتبہ کو واضح کرنے میں نمایاں رول ادا کرے گی، میں نے اس کو حرفاً حرفاً پڑھا ہے اور میں اسے ملت کے لئے مفید سمجھتا ہوں۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کو قبول فرمائے اور نفع عام و تام کرے۔

طہارت کے احکام ومسائل

طہارت ضروریات دین سے ہے، اس کے بغیر کئی عبادتوں کا تحقق نہیں ہوتا، اسی وجہ سے طہارت کو ایمان کا حصہ قرار دیا گیا ہے اور قرآن وحدیث میں اس کی تاکید کی گئی ہے اور اللہ کی محبوبیت کا سبب بتایا گیا ہے، إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ

طہارت کے ساتھ ایک دوسرا لفظ نظافت کا استعمال کیا جاتا ہے۔اس کا مطلب صفائی ستھرائی ہے، عوام ان دونوں کو ایک ہی سمجھتی ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ایک چیز دیکھنے میں بہت صاف ہو، کپڑا خوب چمک رہا ہو؛ لیکن وہ پاک نہ ہو، صاف برتن کو کتے نے چاٹا ہوا اور اس کی طہارت کا وہ اہتمام نہ ہوسکا ہو جس کا حکم شریعت نے دیا ہے، یا کپڑا دھوتے وقت پانی کی پاکی کا خیال نہ رکھا گیا ہو یا پھر اسے اتنی بار نہ دھویا گیا ہو جتنا دھونا طہارت کے لیے ضروری ہے۔

اسی طرح کسی نے غسل کیا، بدن خوب مل مل کر دھویا، غازہ وغیرہ سے اس نے چہرہ کو پرکشش بنالیا، دیکھنے میں بھی صاف ستھرا لگ رہا ہے؛ لیکن جسم کی پاکی کا جو طریقہ شریعت نے مقرر کیا ہے، غسل میں اس کی رعایت نہیں رکھی گئی تو یہ صاف ستھرا انسان پاک نہیں کہا جائے گا۔

اس کے برعکس ایک کپڑا دیکھنے میں صاف نہیں لگ رہا ہے، دھوبی کے دھوئے ہوئے کی طرح چمک بھی نہیں رہا ہے۔لیکن اس کے دھونے میں شرعی اصول ملحوظ رکھے گئے ہیں تو گندہ دکھنے کے باوجود وہ پاک ہوگا اور نماز اس میں ہوجائے گی۔

عام لوگ ظاہری صفائی کی طرف جاتے ہیں، انہیں پاکی کا مطلقا خیال نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ ہمارا دانشور طبقہ غیر مسلم کالونیوں میں رہائش اختیار کرتا ہے اور منہ بسور کر کہتا ہے کہ مسلمانوں کے محلے گندے ہوتے ہیں۔ اور یہ کہتے وقت وہ بھول جاتا ہے کہ اپنے محلوں کو صاف ستھرا رکھنے کے احکام ان کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں۔ وہ ہندو ہوٹلوں میں کھانا پسند کرتا ہے اور اس کے ذہن میں یہ بات

نہیں آتی کہ یہ برتن شام میں باہر رکھا گیا تھا تو کتے نے اپنی زبان سے چاٹ چاٹ کر صاف کر دیا تھا۔

اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں ہے کہ ظاہری صفائی پر توجہ نہ دی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ شریعت میں دونوں مطلوب ہیں، لیکن مدارج میں طہارت کا مقام اونچا ہے۔

ہمارے مخلص دوست حاجی محمود عالم صاحب؛ جنہیں اللہ نے مسائل کو جمع کرنے کا خاص سلیقہ عطا فرمایا ہے اور جن کی کتاب ''رہنمائے حج وزیارت'' کو اللہ نے قبول عام سے نوازا ہے، طہارت کے مسائل کو بڑی محنت سے یکجا کر دیا ہے۔ زبان سلیس اور عمدہ ہے، مسائل کے انتخاب میں روزمرہ کی ضرورت کا خاص خیال رکھا ہے۔ میں نے اللہ کی توفیق سے حرفاً حرفاً پڑھا مجھے یہ کتاب عام مسلمانوں کے لیے بہت مفید اور کارآمد نظر آئی۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کا نفع عام وتام فرمائے۔ اور مؤلف کو دین ودنیا میں اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے۔ آمین

(۱۱/ رجب ۱۴۲۹ھ، ۱۰/ جولائی ۲۰۰۸ء)

نماز رسول اکرم

نماز دین کا اہم رکن ہے، یہ کفر واسلام کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے، فواحش ومنکرات سے روکتی ہے، سماجی اور معاشرتی برائیوں کے اہم سبب کبر ونخوت کو کنٹرول کرتی ہے، اسی لیے اسے عماد الدین کہا گیا اور اقامت صلوۃ کو اقامت دین اور ترک صلاۃ کو ہدم دین سے تعبیر کیا گیا، اسی اہمیت کی وجہ سے نماز میں کھڑے ہونے سے قبل طہارت کے اہتمام کا حکم دیا گیا اور حدث اصغر واکبر سے پاک ہونے کے ساتھ ساتھ کپڑے اور جگہ کی پاکی پر بھی زور دیا گیا، ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد اسلام نے اپنے جماعتی نظام کے استحکام کے لیے باجماعت نماز کی تاکید کی، تاکہ زندگی کے دوسرے اہم امور نیز معاشرتی زندگی میں بھی ایک امت اور ایک جماعت کا تصور قائم رہے، اور عملی زندگی اس کی آئینہ دار ہو، سب کا قبلہ کعبہ ایک ہو اور سب ایک امام وامیر کی اطاعت کو لازم پکڑیں۔

یہ باجماعت نماز مسجد میں ادا کی جائے تو اضافہ اجر کا مژدہ سنایا، اور ہر ہر قدم پر ایک نیکی اور ایک گناہ کے مٹانے کا اعلان فرمایا گیا، باجماعت حاضری کے لیے مسجد میں دل لگا رہے، اس کو بھی باعث اجر قرار دیا، اور مسجد روئے زمین پر اللہ کی پسندیدہ جگہ ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

اس کے باوجود ہماری بدقسمتی ہے کہ سماج میں نماز کا جس درجہ اہتمام ہونا چاہیے، اب تک نہیں ہوسکا، مسجد کی عمارتیں پرشکوہ، دیدہ زیب اور مسلمانی شان کے مظہر کے طور پر بنائی جارہی ہیں، مگر وہ نمازیوں سے خالی ہیں، ان کا پیٹ نہیں بھرتا ہے اور بقول علامہ اقبال

ع   مسجد مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

پھر جتنے لوگ نماز پڑھتے ہیں ان میں سے زیادہ تر نے نماز نہیں سیکھی ہے، انہیں دنیا کا سارا فن آتا ہے اور اس کے لیے انہوں نے تربیت حاصل کی ہے، لیکن نماز کے بارے میں عام احساس ہے کہ یہ بھی کوئی سیکھنے کی چیز ہے، واقعہ یہ ہے کہ اسے سب سے زیادہ سیکھنا ضروری ہے، کیونکہ کسی بھی رکن

کی ادائیگی میں نقص سے نماز نہیں ہوگی اور ہو بھی جائے تو منہ پر مار دینے کے لائق ہوگی اور اگر قیامت میں وہ منہ پر آپڑی تو ہم کہاں کے رہ جائیں گے۔

انہیں احساس وخیالات کے تحت نماز کے موضوع پر چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور اتنی لکھی گئیں کہ دین سے رغبت رکھنے والا کوئی ایسا گھر شاید ہی ملے گا، جس میں ان میں سے دو چار کتابیں موجود نہ ہوں، اس کے باوجود ضرورت تھی کہ کوئی ایسی جامع کتاب لکھی جائے، جس میں فقہی عبارتوں کی جگہ پر آیات واحادیث سے استشہاد کیا گیا ہو، تاکہ عام مسلمان فقہی مسائل کے اصل ماخذ سے واقف ہوسکیں اور انہیں یہ معلوم ہو کہ فقہی عبارتیں بھی نصوص ہی کے تابع ہیں اور حضرت امام ابو حنیفہؒ نے اس سے ہٹ کر کوئی استنباط نہیں کیا ہے۔

اس ضرورت کا احساس بہتوں کی طرح ''مولانا محمد غلام اکبر قاسمی'' کو بھی ہوا، مولانا اچھے عالم ہیں، مطالعہ کا صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں، قرآن کریم اور احادیث مقدسہ سے خاص شغف ہے، برسوں سے مراد پور پٹنہ کی جامع مسجد میں امامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں، اور لوگوں کو اپنی خطابت کے ذریعہ دین سے قریب کرنے اور مسجد سے جوڑنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، یہ اتنا بڑا کام ہے، جو کسی کے صاحب فضل ہونے کے لیے کافی ہے۔

ایسے صاحب علم وفضل کے قلم سے ''نماز رسول اکرم'' وجود میں آئی ہے، میں نے اس کا مطالعہ کیا اور پایا کہ قرآنی آیات اور احادیث سے استشہاد اور حوالوں سے مزین یہ کتاب عام مسلمانوں کے ساتھ اہل علم کے لیے بھی مفید ہے، کتاب کا اسلوب اور انداز اس موضوع پر لکھی گئی بے شمار کتابوں سے الگ تھلگ ہے، اس اہم تالیف کے لیے مولانا موصوف ہم سب کی جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

وصلی اللہ تعالی علی النبی الکریم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

معراج المومنین

نماز اسلام کے ان پانچ ارکان میں ہے، جسے اسلام کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، اور جس نے اسے قائم رکھا اسے دین پر قائم رہنے والا اور جس نے اسے چھوڑ دیا اسے دین کا ہادم یعنی بنیاد کو ڈھانے والا بتایا گیا ہے، یہ برائی اور فحش کاموں سے بچنے کا ذریعہ، اور اللہ کی کبریائی کے سامنے اپنی بندگی، عاجزی اور انکساری کے اظہار کا کامل وسیلہ ہے۔

اسی اہمیت کی وجہ سے اسلام کے بقیہ چار ارکان کی فرضیت کے احکام اسی زمین پر حضرت جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے نازل ہوئے اور دوسرے احکام ومسائل کی طرح ان پر عمل بھی شروع ہوگیا؛ لیکن جب نماز کی فرضیت کا وقت آیا تو پورے اعزاز واکرام کے ساتھ تمام انبیاء کی امامت کے بعد عرش پر بلایا اور قربت کہاں تک پہونچی اور کیا کچھ عطا ہوا، اس کا اجمالی اور بلیغ ذکر قرآن میں " فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنىٰ فَاَوْحىٰ اِلىٰ عَبْدِهٖ مَا اَوْحىٰ " کے ذریعہ کیا گیا ہے، اس واقعۂ معراج نے انسانیت کو عروج بخشا، طائف کی گلیوں میں ٹوٹے ہوئے دل اور پریشان کن احساسات سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو باہر نکالا، اور نماز کی شکل میں قیامت تک مؤمنین کی معراج کا انتظام کیا گیا، جب چاہو سرگوشی کرلو، جب چاہو آواز دے دو، اللہ کا نمبر کبھی مشغول اور بیزی (Busy) نہیں رہتا، یہ ایسا کنکشن (Conection) ہے؛ جس کا ٹاور (Tower) کبھی ڈسٹرب (Disturb) نہیں ہوتا۔ اور سسٹم (Sistum) بھی ایسا کہ باتیں شروع کرو اور احساس وشعور بالیدہ ہے، ایمان ویقین کامل ہے تو پاؤ گے کہ میں اللہ کو دیکھ رہا ہوں، وہ میرے سامنے ہے، میرے قریب ہے اتنا قریب کہ شہ رگ سے بھی قریب، خود ہی فرمایا " نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْد " ۔ شاعر کی زبان میں " اک ذرا گردن جھکائی دیکھ لی "۔ اتنی اور ایسی قربت کے ملنے کے لئے نہ تو کسی زینہ کی ضرورت ہے اور نہ سیڑھی کی، گردن جھکایئے، سجدے کی جگہ پر نگاہ جمایئے اور مانگنا شروع کردیجئے، دنیا والے مانگنے والوں سے بھاگتے ہیں، خالق کائنات خوش ہوتا ہے، مانگو، اور مانگو، جوتے

کا تسمہ بھی مانگنا ہو تو مجھ ہی سے مانگو، "اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ"۔

پانچ وقت تو لازماً کال (Call) کرو، اس کے علاوہ بھی وضو کرو تو نمبر ملالو، مسجد میں داخل ہو تو بھی یاد کرلو، سورج اُگے تو ڈائل کرلو، سورج چڑھ جائے تو سرگوشی کرلو، مغرب سے عشاء تک اوّابین اور آدھی رات کے بعد سے فجر کے پہلے تک لانگ کال، نن اسٹوپ (Long Call, Non Stop) اور ہاٹ لائن (Hot Lane) پر جڑ جاؤ، گناہوں پر پشیمانی ہو تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ سورج گرہن، چاند گرہن، آندھی طوفان آئے تو مسجد کو دوڑ جاؤ، بارش نہ ہو تو اللہ کو یاد کرلو، ہر مصیبت پریشانی اور ہر مشکل کے وقت اللہ سے لو لگالو اور نماز میں مصروف ہوجاؤ۔ " وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوة " قتل ہونے کی نوبت آئے تو بھی اللہ کے دربار میں آجاؤ اور مشورہ لینا ہو تو بھی استخارہ کی نماز پڑھو، جب کہیں جانا ہو تو مسجد جاؤ اور کہیں نہ جانا ہو تب بھی مسجد کا رخ کرلو، خیر ہی خیر، لطف ہی لطف، مزہ ہی مزہ، کیف ہی کیف، جگر کے لفظوں میں:

ہائے ظالم! تو نے چکھی ہی نہیں

چکھ کر تو دیکھو، کر کے تو دیکھو، کیسی مرادیں پوری ہوتی ہیں؟ کیسی نوازش ہوتی ہے؟ عطا وبخشش کی وہ بارش ہوگی کہ سارے آستانے سے ایک آستانہ اور سارے دربار سے ایک دربار پر جم جانے کی نعمت مل جائے گی، اور " یک در گیر محکم گیر" زندگی کا نصب العین قرار پائے گا اور ایک سجدہ ہزاروں سجدوں سے نجات دلائے گا، اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے آدمی کو دیتا ہے نجات

یہ ہزار سجدوں سے نجات اور ایک در پر جم جانے کی نعمت، انسان کی معراج ہے، اسی لئے نماز کو معراج المؤمنین کہا گیا ہے۔

ہمارے مخلص وکرم فرما حاجی محمود عالم صاحب، رہنمائے حج وزیارت، طہارت کے احکام ومسائل، اور سفرِ آخرت کے بعد معراج المؤمنین لے کر آئے ہیں، اور نماز سے متعلق تمام مسائل کا کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیل سے احاطہ کیا ہے، جامعیت ان کی کتابوں کی خصوصیت رہی ہے، یہ وصف اس

کتاب میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

بات، نماز کیا ہے؟ سے شروع ہوتی ہے، صلوٰۃ کے معنی، نماز کے اسرار و رموز، اس کی فضیلت واہمیت، پنج گانہ نمازوں کی فرضیت، ترک صلوٰۃ پر وعید، نماز کے اوقات و رکعات، اذان کی فضیلت ومشروعیت، اس کے کلمات صحت کی شرطیں، اذان کے جواب اور پھر اقامت سے متعلق مسائل تک پہونچتی ہے۔ اس کے بعد نماز کے واجب اور صحیح ہونے کی شرطیں، نماز کے فرائض، واجبات، سنن ومستحبات، مکروہات ومفسدات پر سیر حاصل بحث کیا ہے۔

جماعت کی فضیلت واہمیت، ترک جماعت کے اعذار، صفوف کی ترتیب، سترہ کے مسائل امام کی اتباع، مقتدی کے اقسام، نماز کا طریقہ، ارکان کی ادائیگی کی مسنون شکلیں، دعا اور اس کے متعلقات، مسافر اور مریض کی نماز، قضا کے احکام ومسائل، نفل نمازیں اور سجدۂ سہو یہ سب اس کتاب کے جلی عناوین ہیں، ان عناوین کے تحت پچاسوں ذیلی سرخیاں اور اس کے ذیل میں ہزاروں مسائل کا ذکر۔ ایک کتاب رکھ لیجئے اور دوسری بہت سی کتابوں سے بے نیاز ہو جایئے، یہ ہے معراج المؤمنین کی خصوصیت۔

رفیق مکرم حاجی محمود عالم صاحب کے پاس سلیقہ بھی ہے اور وسائل بھی اور سب سے بڑھ کر توفیق ایزدی، سلیقہ کے ساتھ توفیق نہ ہو تو سلیقہ کس کام کا؟ وسائل ہوں اور توفیق نہ ہو تو دولت کا مصرف لہو ولعب اور اسراف وفضول خرچی قرار پاتا ہے۔

میں اس اہم کتاب کی تالیف پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں، اپنی مشغولیت ومصرفیات کے باوجود میں نے اس کا حرف حرف پڑھا ہے، ضروری مشورے بھی دئے اور حسب ضرورت کہیں کہیں ترمیم واضافہ بھی کیا ہے، یہ مسائل جن کتابوں سے لئے گئے ہیں وہ قابل اعتماد ہیں، اور انہیں من وعن نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، یہ اپنے میں بڑی بات ہے، ہمارا آج کا دانشور طبقہ جس کی صلاحیتیں اخذ مسائل کی بلا واسطہ بنیادی کتابوں سے نہیں ہوتیں، وہ مذہبی امور پر بحث کرتے ہوئے اپنی ہمہ دانی کے زعم میں صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے، تشکیک کا شکار ہو جاتا ہے اور ایسی توجیہہ کرتا ہے کہ عقل ماتم کناں اور نقل فریادی بن جاتی ہے۔

الحمدللہ! حاجی محمود عالم صاحب اس روش سے پاک اور مسائل شرعیہ میں اکابر کے خوشہ چیں اور ان پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں، اسی لئے ان کی کتابیں قاری کو مطمئن کرتی ہیں اور ان کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ حاجی صاحب کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور اسے نماز سے قریب کرنے اور صحیح طور پر نماز کی ادائیگی کا ذریعہ بنادے آمین **یا رب العالمین وصلی اللہ علی النبی الکریم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین .**

جمعہ اوراس کے احکام

مولانا نظام الدین نظمی ساکن جمال پور، دربھنگہ کو میں عرصہ دراز اور نہایت قریب سے جانتا ہوں، وہ نئی نسل کے ان لوگوں میں ہیں جو مذہب وسیات کو "درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق" کے مصداق بنانے پر یقین رکھتے ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو وہ قدیم بزرگوں کی طرح مدرسہ تعلیم القرآن سعد پورہ مظفر پور میں چٹائیوں پر بیٹھ کر درس دیتے ہیں اور دوسری طرف اتحاد پارٹی کے ذریعہ سماج کے پچھڑے اور پسماندہ طبقوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور ان کو معاشرہ میں اونچا مقام دلانے کے لیے کوشاں ہیں، جس کی وجہ سے علاقہ میں ایک قسم کی بیداری پیدا ہوئی ہے۔

مولانا موصوف ایک اچھے قلم کار، بہترین مقرر اور سلجھے ہوئے ذہن کے عالم دین ہیں، وہ روایتی مولویانہ تنگ نظری سے کوسوں دور رہتے ہیں، شاید یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طبقہ کے لوگوں میں یکساں مقبول ومشہور ہیں، سب لوگ انہیں عزیز رکھتے ہیں اور وہ سب پر اپنے علم، شفقت اور ہمدردی کو نچھاور کرتے رہتے ہیں، جو یقیناً اس دور میں بڑی بات ہے، مولانا موصوف نے پیش نظر تالیف "جمعہ اوراس کے احکام" میں فنی چابکدستی کے ساتھ جمعہ سے متعلق مسائل کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے، بالفاظ دیگر انہوں نے دریا کو کوزہ میں بند کردیا ہے، مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ عوام وخواص میں ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور امت مسلمہ میری طرح اس سے خوب خوب استفادہ کرے گی۔

(اکتوبر ۱۹۹۰ء)

الحزب القرآنی

دعا عبادت کی روح، انابت الی اللہ کا مظہر اور توکل علی اللہ کا عملی ثبوت ہے، عاجزی، درماندگی، بے چارگی کے اظہار کا وسیلہ ہے، بندگی اسی کا نام ہے، اس لیے یہ اللہ رب العزت کو بے انتہا پسند ہے، قرآن واحادیث میں دعا کی تاکید کی گئی ہے اور جوتے کا تسمہ تک اللہ ہی سے مانگنے کی ہدایت کی گئی ہے، کن الفاظ میں مانگنا چاہیے؟ اس کے الفاظ قرآن واحادیث میں بھی مذکور اور ماثور ہیں، ان الفاظ کی جامعیت کے اعتبار سے اپنی ایک معنویت ہے، اس لیے دعا کے الفاظ ماثورہ کے استعمال کی اپنی اہمیت ہے، جس کا انکار کسی کو نہیں ہے البتہ دعا کے ان الفاظ کے معنی جاننے سے مانگنے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، معنی نہیں جانیں تو دعا پڑھنا تو ہوگا، مانگنا نہیں ہوسکتا، ہمارے یہاں دعا پڑھنے کا رواج زیادہ ہے، مانگنا ہمیں آتا ہی نہیں ہے، کیوں کہ ان الفاظ کے معنی ہی ہم نہیں جانتے، یہ عجیب وغریب بات ہے کہ ہم جو اللہ سے طلب کررہے ہیں، اس کا علم ہمیں نہ ہو کہ ہم کیا طلب کررہے ہیں۔

مجلسوں میں، تبلیغی اجتماعات میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب تک دعائیں عربی میں مانگی جاتی ہیں، مجمع خاموشی سے آمین کہتا رہتا ہے، اور جب اردو میں دعا شروع ہوتی ہے تو مجمع میں آہ وبکا، گریہ وزاری سے مقبولیت کا پروانہ مل جاتا ہے، پروانہ ملنے کا ادراک واحساس بھی ہمارے قلب کو ہوجاتا ہے، اور ہم خوش خوش اپنے گھر کو لوٹتے ہیں، ایسا صرف دعا کے معنی ومطالب کو اردو میں سمجھنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

انفرادی دعاؤں میں بھی یہ رنگ پیدا ہونا چاہیے، مانگنے کی کیفیت چہرے اور اعضا وجوارح سے عیاں ہو، یہ ضروری ہے، چوراہے پر کھڑے فقیر اور دروازے دروازے آواز لگا رہے درویشوں کو دیکھیے، کیسی کیفیت ان پر طاری ہوتی ہے، روپے دو روپے کے طلبگار تو مانگنے کے ضوابط کو شعوری یا غیر شعوری طور پر برتیں اور ہم جو فلاح دارین کے طالب ہیں، ان کے ہاتھ بھی کسل مندی کے ساتھ بے ترتیب سے اٹھیں، کتنا حیرت ناک ہے، ان دعاؤں کی قبولیت میں انتہائی مؤثر اول وآخر درود شریف

کے پڑھنے کا خصوصی اہتمام ہے، ہمیں اس کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔

ہمارے رفیق گرامی قدر حضرت مولانا مفتی نیر اسلام قاسمی ایسے موضوعات کے لیے موفق اور موید من اللہ ہیں، ان کی کئی کتابیں آچکی ہیں، اس بار وہ قرآنی دعائیں مع چہل درود شریف کا انتخاب آسان ترجمہ کے ساتھ لے کر آئے ہیں، فضائل دعاء، دعا کی حقیقت، قرآنی دعا کے فضائل، قبولیت دعا، ارکان دعا، شرائط دعا، مستحبات دعا، فضائل درود شریف وغیرہ جیسے اہم مباحث کا اضافہ کیا ہے، صبح وشام کے وظائف کے لیے جو دعائیں قرآن واحادیث میں مذکور ہیں، ان کے احاطہ کی کوشش کی گئی ہے، ترجمہ انتہائی سادہ اور سلیس ہے، رسالہ کی افادیت اس سے بڑھ گئی ہے، اللہ تعالی نے مفتی صاحب کو محمد مجیب الحق ضیاء جیسا سنجیدہ شاگرد عطا کیا ہے، جو عربی دوم سے ہی مفتی صاحب کے اس قسم کے کاموں میں معاون بنا ہوا ہے، تصنیف وتالیف سے عزیز سلمہ کی دلچسپی ان کے روشن مستقبل کی دلیل اور ستارۂ بلندی کی نوید جانفزا ہے، ابھی وہ درجہ عربی چہارم میں امارت شرعیہ کے مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ میں زیر تعلیم ہیں، درسی کتابوں کے انہماک کے ساتھ ان کاموں کا کرنا بتاتا ہے کہ وہ وقت کی قدر کرتے ہیں۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس رسالہ کی افادیت عام فرمادے، اور دعائے ماثورہ کے اہتمام کی توفیق مجھے بھی عنایت فرمائے۔

رہنمائے حج وزیارت (طبع اول)

اللہ تعالی نے انسان کو پیدا کیا، اسے اشرف المخلوقات بنایا اور اس کے لیے دین اسلام کو پسند کیا، سارے انبیاء کرام علیہم السلام اسی دین کی دعوت پہنچانے کے لیے مبعوث ہوئے اور انہوں نے ''بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم'' لے جانے کا وہ عظیم کارنامہ انجام دیا، جو نصرت الٰہی اور تائید ایزدی کے بغیر ممکن نہیں۔

لیکن انسان کی تخلیق جن عناصر اربعہ (آگ، مٹی، پانی، ہوا) سے ہوئی ہے، ان کے کچھ ذاتی خواص ہیں، آگ کے اندر تکبر وانانیت، مٹی کے اندر بخل، پانی کے اندر حرص اور ہوا کے اندر امتیاز وخودنمائی کے امراض خبیثہ کے جراثیم چھپے ہوئے ہیں۔ یہ جرثومے انسانی زندگی کو غیر متوازن اور غیر معتدل کرتے رہتے ہیں۔

اسی لئے اللہ رب العزت نے ان جراثیم کو کنٹرول اور قابو میں رکھنے کے لیے ہمیں چار عبادتیں دیں، آگ کے خواص کو قابو میں رکھنے کے لیے نماز، مٹی کے خواص پر قابو رکھنے کے لیے زکوۃ، پانی کے خواص پر قابو پانے کے لیے روزہ اور امتیاز وخودنمائی کی بیماری کو کنٹرول کرنے کے لیے حج فرض کیا اور ان سب کا مرکز کنٹرول اور مین سوئچ توحید باری اور رسالت محمدی ﷺ کو قرار دیا، جسے ہم کلمہ کہتے ہیں۔ یہ اجمال بہت تفصیل کا متقاضی ہے، لیکن یہاں اس کا موقع ہے اور نہ گنجائش۔

یہاں اس کتاب کی مناسبت سے صرف یہ کہنا ہے کہ حج وہ عبادت ہے جس سے ہمارے اندر سے امتیاز وخودنمائی کی بیماری ختم ہوتی ہے، یہ مرض زیادہ تر مالداروں میں پایا جاتا ہے، اس لیے حج کی فرضیت کے لیے ''استطاعت'' کو لازم قرار دیا گیا، اور پھر اپنے دیار میں بلا کر عشق وشوق، فدائیت اور شیفتگی کے ان مراحل سے گزرنے کا حکم دیا گیا، جس میں سب کا لباس (احرام) ایک ہو، زبان (تلبیہ) ایک ہو، اور رہائش میں بھی یکسانیت ہو، تاکہ علاقائی، لسانی، آرائشی اور بود وباش تک میں امتیاز وخودنمائی اور تعصبات

کا خاتمہ ہو جائے۔

اس عشق وشوق اور فدائیت میں انسان کو دیوانگی کے ساتھ ہوش وخرد کے اس منزل سے بھی گزارا جاتا ہے، جہاں بندہ اللہ کے جلال اور رسول اکرم ﷺ کے جمال رخ زیبا کا تصور کر کے بھی گریباں چاک نہیں کرتا اور صحرا نوردی کے لیے نہیں نکل کھڑا ہوتا۔

یہ راہ عشق کی راہ ہے، محبت کی راہ ہے، فدائیت اور نیستی کی راہ ہے۔ اس راہ کے اصول وآداب، فرائض وواجبات، سنن ومستحبات، مکروہات وسیئات سے واقف ہونا انتہائی ضروری ہے تاکہ کوئی ادا، کوئی حرکت اور کوئی کام محبوب کی مرضی کے خلاف نہ ہو جائے۔ ان مسائل سے عدم واقفیت کے نتیجے میں اس روحانی سفر کے فیوض وبرکات تو کجا کبھی کبھی ادائیگی اور عدم ادائیگی کا مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے۔

اللہ جزائے خیر دے ہمارے مخلص ومحترم جناب الحاج محمود عالم صاحب کو جنہوں نے اس راہ کے مسائل پر اس کتاب میں بھر پور، تفصیلی، مکمل اور جامع گفتگو کی ہے۔ اللہ تعالی نے انہیں تفہیم کی ایسی صلاحیت دی ہے، جو کم لوگوں کے حصہ میں آتی ہے، انہوں نے اپنی اس خصوصی صلاحیت کی بدولت ہر ہر مسئلہ کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے، تاکہ کم پڑھا لکھا بھی اس کو پڑھ کر خود سمجھ سکے۔

حج کے موضوع پر یوں تو بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور واردات قلبی کے ساتھ مسائل بیان کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے؛ لیکن یہ کتاب ان میں بہتر اضافہ ہے، جو اپنی جامعیت اور بعض دوسری خصوصیات کی وجہ سے ان سب میں منفرد ہے۔

اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو قبول عام عطا فرمائے اور اسے ان کے حق میں ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین

رہنمائے حج وزیارت

(طبع ثانی)

رہنمائے حج وزیارت کی یہ دوسری اشاعت ہے، پہلی اشاعت ۲۰۰۲ء میں ہوئی تھی اور اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا، مسائل وجزئیات پر باریک نگاہ، محتاط انداز بیاں، بہترین اسلوب نگارش کی وجہ سے یہ کتاب عازمین حج میں کافی مقبول ہوئی۔ خود مجھے بھی جب اللہ نے یہ سعادت دی تو زاد راہ کے طور پر اسے ساتھ رکھا اور ہر موقع سے جہاں ضرورت پڑی اس سے فائدہ اٹھایا۔

مؤلف نے اس کتاب کی ترتیب واشاعت میں خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے، مسائل پر لکھی گئی کتابیں عام طور سے خشکی لیے ہوتی ہیں، ان میں ادبیت کی تلاش فضول ہے؛ لیکن اس کتاب میں مؤلف کا قلم مختلف موقعوں سے وجد میں آ گیا ہے اور عشق ومستی کی جو کیفیت خود ان پر ذکر ''جلیل وجمیل'' میں طاری رہی ہے، کاغذ پر آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔ جستہ جستہ اس اندرونی سوز وکیف نے کتاب کو خشکی سے پاک کر کے دل چسپ بنا دیا ہے، اور پڑھنے میں بالکل ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ ہم مسائل کی صحرا نوردی کر رہے ہیں، ایک دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے اور مطالعہ کرنے والا اس کے سحر سے نہیں نکل پاتا ہے، یہ اسلوب نگارش کا کمال ہے۔

پہلی اشاعت میں بھی حرفا حرفا دیکھا تھا جب میں مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور ویشالی میں تھا، دوسری اشاعت کا موقع آیا تو حاجی محمود عالم صاحب نے پھر سے نظر ثانی کے لیے میرے حوالہ کیا، چنانچہ دوبارہ اس پر نظر ثانی کی گئی، اور اب یہ پہلے سے زیادہ مفید اور جامع ایڈیشن کے طور پر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ حاجی صاحب کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور اس کا افادہ عام وتام ہو۔

آسان عبادت

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، ایمان، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، بنیاد کا مطلب یہ ہے کہ ان پر اسلام کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، بنیاد ہی غائب ہو تو عمارت کی تعمیر نہیں کی جاسکتی ہے، ہوائی محل وجود میں آسکتا ہے، جس کا وجود وعدم برابر ہوگا، مسلم سماج میں یہ بنیاد دن بدن کمزور ہوتی جارہی ہے، نماز سے غفلت عام ہے، روزوں سے مریض بن کر جان چھڑالیا جاتا ہے، حالانکہ مرض میں اسلام نے رخصت دیا ہے، تمرض (بتکلف مریض بننے والوں) کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے، زکوٰۃ تاوان سمجھا جاتا ہے اور پائی پائی کا حساب لگا کر زکوٰۃ نکالنے والوں کی تعداد انتہائی کم ہے، حج کو مال کا ضیاع اور تفریح کا ذریعہ سمجھا جارہا ہے، ایمان کی لڑکھڑاہٹ عام ہے، اللہ پر یقین واعتماد کی کمی ہے، وسائل وذرائع نے مقاصد کا درجہ حاصل کرلیا ہے، اور ان کی طلب جائز وناجائز کی تفریق کے بغیر عام ہے، ہر آدمی کھلی آنکھوں اسے دیکھ سکتا ہے، مسجد جانا ہی نہ ہوتا ہو تو طہارت، وضو، تیمّم اور غسل کے آداب جاننے اور سیکھنے کی ضرورت کون محسوس کرے اور کیوں کرے؟

کھانے پینے کا انداز مغربیت سے متاثر ہوا اور بوفے سسٹم (Buffy system) میں ہر آدمی پلیٹ اے کر فقیر سا بن گیا ہو اور ہر اقسام کے کاؤنٹر پر گردش کررہا ہو، تو دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے پینے اور انگلیوں کے استعمال کی بات کس طرح مسلمانوں کو سکھائی جائے، سونے، پڑنے اور نکاح کی سنت کی عظمت کا احساس کتنے دلوں میں باقی رہ گیا ہے، جیسے چاہے پڑ گیے اور جس طرح چاہا سولیا، نکاح کہنے کی حد تک سنت ہے، لیکن لڑکوں کے دام جس طرح لگ رہے ہیں، اس نے نوجوانوں کو بکاؤ مال بنادیا ہے، اب یہ رشتہ تجارت ہے، مالی نفع ونقصان کے پیمانے میں تولا جارہا ہے، سماجی برتری اور معیاری زندگی کے سرمایۂ حقیر کو نکاح کی اساس بنادیا گیا ہے۔

سب کچھ مادی پیمانے میں تولا جائے اور وسائل وذرائع اصل بن جائیں تو دعا کی طرف کس کی

توجہ ہوگی اور انابت الی اللہ اور رجوع الی اللہ کی فکر کا کیا موقع باقی رہے گا؟ سماج آج اسی رخ پر جارہا ہے اور ایک بڑے طبقے کی نظر میں دعا دل کی تسلی کا ذریعہ رہ گیا ہے، اور دعاؤں کا اہتمام بھی ہمارے دلوں سے نکل گیا ہے، یا نکلتا جارہا ہے۔

مسلم سماج میں ان کمیوں اور کوتاہیوں کا احساس بہتوں کو ہے، لیکن بہت لوگ لکھ نہیں پاتے ہیں، کچھ بول نہیں پاتے ہیں اور دل میں کڑھ کر رہ جاتے ہیں، یقیناً یہ بھی ایمان کا ایک درجہ ہے، لیکن کم تر درجہ ہے، حدیث میں اسے ''اضعف الایمان'' کہا گیا ہے۔

ہمارے مولانا محمد عالم قاسمی بن جناب مقصود عالم مرحوم جن کا تعلق مردم خیز ضلع اور بقول ہمارے دوست قاری بدر عالم طیبی ناظم معہد العلوم الاسلامیہ چک چمیلی ویشالی ضلع مقبول مدھوبنی سے ہے، وہ پتونا بسفی کے رہنے والے ہیں، حافظ ہیں، قاری ہیں، دارالعلوم دیوبند سے فاضل حدیث ہیں، بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے دو سبجکٹ میں فاضل ہیں، عربک پرشین بورڈ الہ آباد سے عالم ہیں، مگدھ یونیورسیٹی سے ایم اے ہیں، علوم شرقیہ کے امین ہیں، علوم عصریہ پر بھی خاصی نگاہ ہے، سماج کی ضرورتوں کو سمجھتے ہیں، برتتے ہیں اللہ نے زبان بھی دیا ہے قلم بھی، زبان کا استعمال پابندی سے جمعہ میں کرتے ہیں اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لانے کی جدوجہد میں مشغول ہیں، اخبارات میں مضامین لکھتے ہیں، کتابیں تیار کرتے ہیں اور ان کے مداح اور متوسلین اس کو عام لوگوں تک پہونچانے کا کام کرتے ہیں، چنانچہ کتاب کے ایڈیشن پر ایڈیشن نکل رہے ہیں، سادگی، تواضع اور انکساری ایسی کہ عام آدمی کو بتایئے کہ یہی مولانا محمد عالم قاسمی ہیں، تو حیرت واستعجاب سے چلا اٹھے کہ اچھا! تو یہی مولانا محمد عالم قاسمی ہیں!

بقول ڈاکٹر کلیم عاجز: ''نہ جبہ، نہ قبہ، نہ دستار، نہ عصا، نہ اہالی نہ موالی نہ کوئی آگے نہ پیچھے، بس جب دیکھو، جہاں دیکھو وہی کرتا پاجامہ، چپل چٹخاتے پھرتے ہیں۔''

اس پر اضافہ کرنا ہو تو کہہ لیجیے کہ کبھی شیروانی زیب تن کرلیتے ہیں، اور عطر کی خوشبو سے اپنا دماغ بھی معطر رکھتے ہیں۔

ع اس سادگی پر کون نہ مرجائے اے خدا

لوگ اس سادگی پر مرتے رہتے ہیں ، مٹتے رہتے ہیں ، عہدے اور ذمہ داریاں ان کی جھولی میں ڈالتے رہتے ہیں کبھی تنظیم تحریک ائمہ مساجد بہار، مدرسہ حمیدیہ نسوان پتونا مدھوبنی اور الکوثر ٹرسٹ کھرما پتھرادر بھنگہ کا سکریٹری بنادیا، ادارہ سبیل الفلاح پتونا کی صدارت بھی حصے میں آئی، امارت شرعیہ سے تعلق ہوا، تو امارت شرعیہ کے نقیب ہوئے، مجلس منتظمہ دار العلوم الاسلامیہ امارت شرعیہ اور ہوسپٹل کے رکن بنائے گئے، ''عوام بہار'' کے نائب صدر اور رفاہ امت سوسائٹی دریاپور کے اکزیکیٹو ممبر ہیں، یہ سارے عہدے ان کی مقبولیت کی دلیل ہیں۔

لیکن بڑی بات یہ ہے کہ ان عہدوں کو وہ ذمہ داری سمجھتے ہیں، یہ عہدے ان کے لیے وجہ افتخار نہیں، کام کرنے کا ذریعہ ہیں، وہ دریاپور مسجد کے برسوں سے خطیب ہیں اور اگر وہ پیر ہوتے اور مریدوں کی فوج درفوج ان کے پاس ہوتی تو اتنے دنوں تک ایک مسجد کی امامت ان کی کرامت کہلاتی۔

اسی کرامت کے نتیجے میں ہر جمعہ کو وہ خطاب کرتے ہیں، جمعہ کا مجمع ہر طبقے کا ہوتا ہے، اور ہر سطح کے لوگ ہوتے ہیں، اس میں باتیں اس رعایت سے کرنی ہوتی ہے کہ سب کی سمجھ میں آجائے، سب کی سمجھ میں صاف آجانے کا نام ہی بلاغت ہے، یہ بلاغت ان کی زبان میں بھی ہے اور ان کی تحریروں میں بھی، سادگی، شستگی انکی زندگی کا لازمہ ہی نہیں تحریر وتقریر کا بھی جز بن گیا ہے، ایک کام کو بار بار کرتے رہیے تو وہ عادت بن جاتی ہے اور عادت کا صدور خواہی نخواہی ہوتا رہتا ہے۔

مولانا کی تحریروں میں اس سلاست اور بلاغت کو دیکھنا ہو تو ان کی تصنیفات متاع دین، ہمارا پیارا دین اسلام کے چھ حصے، جدید آسان قواعد اول، دوم، پنجم کو دیکھنا چاہے، آسان عبادت بھی انکی سادہ تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔

آخر الذکر کتاب کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر آرہا ہے، مذہبی کتابوں کی کساد بازاری کے اس دور میں جب کہ فکشن کے قاری بھی گم ہوتے جارہے ہیں، کسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن مصنف کی مقبولیت اور کتاب کی اہمیت کو بتاتا ہے۔

''آسان عبادت'' میں جو موضوعات اٹھائے گیے ہیں، اس کی جانب میں نے ہلکا اشارہ شروع میں کردیا ہے، یہ موضوعات بنیادی دینی تعلیم کے وہ اجزاء ہیں، جن کا جاننا ہر مسلمان کے لیے

فرض ہے۔

کتاب کے مندرجات مختصر اور جامع ہیں، اس اختصار میں مزید توضیح ہونی چاہیے تھی، مثلا غسل کی چار قسمیں فرض، واجب، سنت، مستحب کا ذکر کیا گیا ہے اور وضاحت صرف فرض کی، کی گئی ہے، وہ بھی اس طرح کہ جب بدن ناپاک ہوجائے۔ دوسری قسموں کا بھی ایسا تذکرہ ہوتا کہ قاری متعارف ہوجائے تو اچھا ہوتا، غسل کا ذکر ہوا تو غسل کی فرضیت کے اسباب بھی مذکور ہونے چاہیے تھے، تیمّم کی بحث میں پانی نہ ملنے کی مسافت کا ذکر ضروری تھا، یعنی پانی کتنی دور تک نہ ملے تو تیمّم جائز ہوگا؟ اس قسم کی مثالیں اور بھی ہیں، لیکن فہرست سازی مقصود نہیں۔

کتاب کے پہلے ایڈیشن میں قیمت درج نہیں ہے، تبلیغ اسلام اور ترویج دین مبین کے لیے شاید اس کتاب کی تقسیم مفت ہوتی ہوگی، اگلا ایڈیشن بھی بغیر قیمت کے آوے تو لوگوں تک آسانی سے پہونچ جائے گا اور وہ بھی مستفید ہوں گے جن کے پاس قوت خرید نہیں ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ مولانا کی اس خدمت کو قبول عام حاصل ہو اور اس کا فائدہ عامۃ المسلمین کو پہونچے، آمین۔

☆☆☆☆

متاع دین

مولانا محمد عالم قاسمی عالم باعمل ہیں، دنیا کے بازار میں ''متاع دین'' لے کر آئے ہیں، گو یہ متاع ان دنوں کساد بازاری کا شکار ہے؛ لیکن ہم جیسے لوگ جن کی پہچان اور شناخت تمام تر کمی وکوتاہی کے اقرار واعتراف کے باوجود دین وشریعت ہے، اس کساد بازاری سے نہ تو مایوس ہیں اور نہ خائف، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر تاریک رات کے بعد صبح کا اجالا مقدر ہے اور اسے کوئی روک نہیں سکتا؛ کیونکہ قدرت کے فیصلے قیامت تک کے لیے اٹل ہیں۔

اب یہ ہماری قوت فکر وعمل پر منحصر ہے کہ ہم اس سویرے کو کس قدر جلد لے آتے ہیں، آج دنیا جس طرح اسلام سے دور ہو کر کراہ رہی ہے، اور انسانیت سسک رہی ہے، ایسے میں اسلام پوری دنیا کی آخری امید ہے، جس نے چودہ سو بتیس سال پہلے بھی دنیا کو ضلالت وگمراہی سے باہر نکالا تھا اور آج بھی سارے درد کا مداوا اسی کے پاس ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس متاع بیش بہا اور بیش قیمت کی ''مارکیٹنگ'' صحیح انداز میں کریں، ہماری فکر، ہماری سوچ اور ہمارے اعمال، اسے لوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ بن جائیں، یہ اس وقت کا بڑا کام ہے، مولانا محمد عالم قاسمی گزشتہ پچیس سالوں سے اس ''متاع دین'' کو لوگوں تک پہنچانے میں لگے ہوئے ہیں اور اس کے لیے وہ اپنی ہمہ جہت صلاحیت کو جو رب کائنات نے انہیں خاص طور پر ودیعت کی ہے، کام میں لا رہے ہیں، تحریر وتقریر، تحریک وتنظیم اور درس قرآن کریم ودرس بخاری شریف کے ذریعہ اللہ ان سے یہ کام لے رہا ہے اور اس کے مفید، مثبت اور دور رس اثرات سماج پر پڑ رہے ہیں، ایک خاص بات یہ ہے کہ جتنا کچھ وہ الفاظ کے ذریعہ لوگوں تک پہنچاتے ہیں، اس سے کہیں زیادہ ان کی خاموش زندگی لوگوں کو متاثر کرتی ہے اور میرا خیال ہے کہ

ع   بہتر ہے کہ لفظوں کے بجائے زندگی بولے

اس کائنات میں سب سے زیادہ جس ذات گرامی کی زندگی بولتی ہے وہ آقا مولا فخر موجودات سرور

کونین ﷺ کی ذات گرامی ہے، مولانا محمد عالم قاسمی نے ''متاع دین'' کا آغاز محسن انسانیت سے کیا ہے، انہوں نے کئی مضامین میں داعی کی حیثیت سے آقا ﷺ کے ابتلاء وآزمائش کا ذکر کیا ہے، وطن چھوڑنا، ابتلاء وآزمائش کی ہی ایک شکل ہے، اس لیے خاص طور پر ہجرت کے سفر پر قلم اٹھایا ہے، آپ کی بعثت کے مقصد پر تفصیل سے گفتگو کیا ہے، رحمت عالم ﷺ کے تعدد ازدواج کے حوالہ سے بھی بصیرت افروز اور چشم کشا بحث مجموعہ میں آ گئی ہے، عشق ومحبت میں ڈوبی یہ تحریریں فکر کی پاکیزگی، اسلوب کی سادگی اور اثر آفرینی کی وجہ سے خاص طور پر قابل ذکر ہیں، انہوں نے امن وسکون کی تلاش میں پریشان حال لوگوں کو بتایا ہے کہ سکون اللہ کی ہدایت پر عمل کرنے میں ہے، ہمدردی ایک عمدہ صفت ہے، عیب جوئی بری عادت ہے، اتحاد امت، وقت کی ضرورت ہے، اختلاف رائے نفرت کا ذریعہ نہیں ہے، دعا مومن کا ہتھیار ہے، نماز آسمانی تحفہ ہے، مجموعہ کے دیگر مندرجات میں قرآن کریم، مساجد ومدارس، قربانی، اخلاقی معاشرتی زندگی کی بنیاد، علم، حجاب اور پردہ، محرم، شعبان، رمضان وغیرہ پر مضامین شامل ہیں، پوری کتاب میں زمانی فاصلہ کی وجہ سے اسلوب نگارش میں کہیں فرق محسوس ہوتا ہے، لیکن درد دل کے اظہار میں اسلوب نگارش کی اہمیت نسبتا کم ہوتی ہے، الفاظ کا سنجیدہ اور سلیقہ سے استعمال ترسیل کا ذریعہ ہے اور اصلاحی مضامین ومقالات میں ترسیل ہی اصل ہے؛ اس کے لیے استعارہ اور صنائع وبدائع سے پاک زبان زیادہ مفید ہے، مولانا محمد عالم قاسمی نے اس کام کے لیے جو زبان استعمال کی ہے، وہ انتہائی موزوں اور ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کے مصداق ہے۔

میں نے اس کتاب کو جستہ جستہ پڑھا ہے، اپنی مصروفیات ومشغولیات کی وجہ سے حرفا حرفا نہیں پڑھ سکا، لیکن جتنا پڑھ سکا، اس کی بنیاد پر میرا احساس ہے کہ یہ کتاب دعوتی واسلامی نقطہ نظر سے انتہائی اہم ہے اور بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم لے جانے کا بہترین ذریعہ بھی، اس کے علاوہ جو لوگ مسلسل اسٹیج کی زینت بنتے ہیں اور ہر دن سوچتے ہیں کہ آج کس موضوع پر زبان کھولوں، ان کو اس مجموعہ سے موضوعات بھی ملیں گے اور مواد بھی۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس ''متاع دین'' کو گھر گھر پہنچائے اور یہ لوگوں کی دینی ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ بنے آمین یا رب العالمین وصلی اللہ علی النبی الکریم

(۱۱/ رجب ۱۴۳۲ھ - ۱۴/ جون ۲۰۱۱ء)

مقالات اکبر

مولانا غلام اکبر قاسمی امام جامع مسجد مراد پور، سبزی باغ پٹنہ کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو منصب امامت پر فائز ہونے کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا بھی خاص ذوق اور ملکہ رکھتے ہیں، ایک طرف وہ جمعہ کے خطبہ سے قبل اپنے بصیرت افروز خطاب کے ذریعہ مسلمانوں کی ذہن سازی اور ملت کی سر بلندی کے لئے ہر فرد کو اٹھ کھڑے ہونے کا پیغام دیتے ہیں، تو دوسری طرف ان مسائل پر مسلسل لکھتے رہتے ہیں؛ جن کی سماج کو ضرورت ہے۔ یہ مضامین ومقالات اخبارات ورسائل میں نمایاں طور پر شائع ہوکر مقبول ہورہے ہیں۔اور قارئین کا ایک بڑا طبقہ اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔

لیکن اخبارات کی عمر صرف ایک دن کی ہوتی ہے، اور قاری دوسرے دن ان مسائل کو عموماً بھول چکا ہوتا ہے جو گذشتہ کل اخبارات کی زینت بن چکے ہیں، وہ مضامین بھی عموماً ذہن سے نکل جاتے ہیں، جن کو پڑھ کر ذہن ودماغ خاصہ متاثر ہوا تھا۔ اخبارات سے ان مضامین کو نکال کر بار بار پڑھنا بھی ایک مشکل عمل ہے۔ ایسے میں مضامین کی افادیت کو عام کرنے اور اسے دیر تک قاری کے ذہنوں میں بٹھائے رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اسے کتابی شکل دیدی جائے۔

مقالات اکبر ایسے ہی مضامین ومقالات کا قیمتی مجموعہ ہے، جو اخبارات کی زینت بن کر مقبول عام ہو چکے ہیں، اور جن کے ذریعہ اسلامی خطوط پر ذہن سازی کے لئے سعیٔ مشکور کی گئی ہے۔ مولانا نے اپنی تحریروں میں جن موضوعات کو اٹھایا ہے، ان میں بڑا تنوع ہے، اسلامیات کے حوالے سے انہوں نے معاشرت، معاملات، سماجیات اور دفاع عن الاسلام جیسے اہم موضوعات پر سیر حاصل بحث کیا ہے، اور کس طرح ہم زندگی کے سارے مسائل میں اسلامی نہج اور رخ اپنا سکتے ہیں، اس کی عملی شکلیں بھی پیش فرمائی ہیں۔

ان مقالات میں مواد کی فراوانی، اسلام کی واضح ترجمانی، اسلوب کی سلاست وروانی قاری

کے ذہن ودماغ کو اپیل کرتی ہے، اور اس کا دیرپا اثر قائم ہوتا ہے، جس سے دوررس اثرات کی توقع کی جاتی ہے۔ میں مولانا کو اس اہم تالیف پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی اسے قبول فرمائے اور اسے لوگوں کی اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

سفر آخرت

اللہ تعالی نے حیات وموت کو پیدا کیا، اور اسے دوسرے جانداروں کی طرح انسان وجن کے کالبد خاکی وناری میں ڈال دیا، پھر چونکہ کائنات کی اصل روح یہی دو مخلوق ہیں اور بقیہ ساری چیزیں ان کی خدمت کے لیے بنائی گئی ہیں، اس لیے دوسرے ذی روح کے برعکس اس کے حیات ومَمات کو اعمال حسنہ کی جانچ کا ذریعہ بنایا گیا، اسے دونوں راستے دکھا دیے گئے اور انبیاء کرام کو صحیح رہنمائی کے لیے مبعوث کیا گیا، پوری کائنات کی تخلیق اس طرح کی گئی کہ وہ اللہ کی وحدانیت پر مظہر اتم بن گئی، دنیا کو سجا، سنوار کر پیش کیا گیا اور اسے آخرت کی کھیتی کے طور پر استعمال کا حکم ہوا، عالی شان محلات دیئے گئے، آرام وراحت کا سارا سامان دیا گیا اور حکم ہوا کہ اسے پردیسی کی طرح استعمال کرو یا مسافر کی طرح، خلاصہ یہ کہ دل اس سے نہ لگاؤ، تم دنیا کے بغیر نہیں رہ سکتے، لیکن دنیا تمہارے اندر داخل نہ ہو جائے، اس کی فکر ہر آن اور ہر لمحہ رکھو، جس طرح کشتی بغیر پانی کے نہیں چلتی، لیکن پانی اگر کشتی میں داخل ہو جائے تو سارے مکین غرق آب ہو جائیں گے، ٹھیک اسی طرح اگر دنیا تمہارے اندر داخل ہوگئی تو آخرت تباہ ہو جائے گی، گویا مومن کی زندگی کا رخ اور نہج، تصور آخرت، رضاء الٰہی کی فکر اور جنت کے حصول کی خواہش سے متعین ہوتا ہے۔ خوف خدا، عذاب الٰہی اور جہنم کی آگ کا ڈر اسے غلط راستوں پر چلنے، کارگاہ حیات میں بھٹکنے اور حرام سے باز رہنے کا حوصلہ بخشتا ہے، اور وہ ساری زندگی دنیا کو آخرت کی کھیتی سمجھ کر گزار دیتا ہے، قدم پھونک پھونک کر رکھتا ہے، اسے ہر گام پر اللہ کے حکم اور رسول اکرم ﷺ کے طریقے کی جستجو اور فکر رہتی ہے۔

کچھ ایسے بھی پاک نفوس ہوتے ہیں جو اپنے ساتھ دوسروں کی فکر بھی کرتے ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی میں لگ جاتے ہیں، اس کے لیے کتابیں لکھتے ہیں، سنت کو پھیلاتے ہیں، بدعات ورسومات سے اجتناب کی تلقین کرتے ہیں۔

ہمارے محترم دوست حاجی محمود عالم صاحب کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہے، جو اپنی اصلاح کے ساتھ ملت کی فکر بھی کرتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ سارا معاشرہ سنت کے مطابق تشکیل پا جائے اور بدعات وخرافات، رسومات واوہام سے معاشرہ میں نفور پیدا ہو جائے، حاجی صاحب تعلیم کے اعتبار سے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ اور پیشہ کے اعتبار سے کامیاب تاجر ہیں، اللہ رب العزت نے انہیں تصنیف وتالیف کا صاف اور ستھرا ذوق عطا فرمایا ہے۔

حاجی صاحب کی یہ کتاب جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کا عنوان ہی ''سفر آخرت'' ہے، اس موضوع کا انتخاب بذات خود مؤلف کے اندرونی حالات اور فکر کی آئینہ دار ہے۔

میں نے اس کتاب کو حرفا حرفا دیکھا ہے اور اس کے مندرجات کو مستند اور معتبر کتابوں سے ماخوذ پایا۔ اس موضوع پر درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ کتاب ان میں اپنی جامعیت کے اعتبار سے ممتاز اور منفرد ہے، اس اہم کام کے لیے مؤلف ہم سب کی جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو قبول فرمائے اور اسے ملت اسلامیہ کے لیے نفع کا ذریعہ بنائے۔ آمین

مرنے کے بعد بھی

مفتی محمد فیاض صاحب قاسمی باصلاحیت عالم دین ہیں، لکھتے ہیں، بولتے ہیں، پڑھتے ہیں، پڑھاتے ہیں، لوگوں کی اصلاح کے لیے سوچتے ہیں اور دنیا وآخرت کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ ان کی اسی فکر مندی کی وجہ سے یہ رسالہ وجود میں آیا؛ جس میں انہوں نے مختصراً ان اعمال کی نشان دہی کی ہے، جو مرنے کے بعد بھی کام آنے والے ہیں اور جن کی طرف سے غفلت عام ہے۔ انداز تحریر صاف اور شستہ ہے۔ بھاری بھرکم الفاظ کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ اس لیے کم پڑھنے والے لوگ بھی اس سے حسب شوق وذوق اور حسب استطاعت فائدہ اٹھا کر اپنی آخرت کے لیے ثواب جاریہ کا نظم کر سکتے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس رسالہ کو نفع عام کا ذریعہ اور مؤلف کے لیے ذخیرہ آخرت بنادے اور اسے قبول عام نصیب ہو۔ آمین!

(۲۵/محرم ۱۴۳۴ھ-۱۰/ دسمبر ۲۰۱۲ء)

اسلامی معاشرہ

معاشرہ جس تیزی سے بگاڑ اور فساد کا شکار ہو رہا ہے، اس کا تصور ہر حساس انسان کے لیے اذیت ناک اور کرب ناک ہے، فحاشی و بے حیائی، عریانیت و بدعنوانی، ظلم و بربریت، حق تلفی اور حق سلبی، ذمہ داریوں سے پہلوتہی، غیبت، چغل خوری، لعن، طعن، وقت کا ضیاع، سہولت پسندی، جنسی انارکی، اباحت پسندی اور عیش کوشی اور نہ جانے اس قسم کے کتنے امراض ہیں، جو سماج کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں، اخلاقی اقدار اٹھتے جا رہے ہیں، شرم وحیا سے دامن چھڑایا جا رہا ہے، دل کی بات زبان پر لاتے ہوئے آدمی ڈرتا ہے۔ عزت، اکرام و احترام کے جذبے سے نہیں؛ شر و فساد سے محفوظ رہنے کے لیے کی جا رہی ہے، ایسے میں ضرورت ہے کہ ملک وملت کی تعمیر نو کے لیے صالح قیادت سامنے آئے، مصائب ومشکلات کا قرآنی حل پیش کیا جائے، امانت ودیانت کی اہمیت واضح کی جائے، ملک وملت کو ترقی کا راز بتایا جائے، مساوات اور احترام انسانیت کا درس دیا جائے۔ اور لوگوں کو بتایا جائے کہ صرف اسلام ہی انسان دوستی کا مذہب ہے، اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان خود شناسی کے مراحل سے گذرے، اسے خدا کے سامنے حاضر وناظر ہونے کا یقین اور ادراک ہو، خود اعتمادی کے ساتھ نئی نسل کی بے راہ روی پر نکیر کی جائے، عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اپنی ذمہ داری کو سمجھا جائے، تعلیم کو خاتون خانہ تک پہنچایا جائے، اصلاح معاشرہ کے لیے مدارس کے کردار اور سماج میں علماء کی قدر و قیمت کو ابھارا جائے، نئی تہذیب کے مقابلہ کے لیے فرد، سماج اور معاشرہ کو تیار کیا جائے۔ ہر حال میں سماج کو ٹوٹنے سے بچایا جائے، شرعی احکام کا پاس ولحاظ رکھا جائے اور قرآن کریم کو دستور حیات مان کر اللہ کے رسول ﷺ کی حیات مبارکہ کو اپنے لیے آئیڈیل اور نمونہ بنایا جائے۔

کرنے کے لیے یہ کام بہتوں کے ذہن میں آتا ہے، یہ احساس بہت لوگوں کو پریشان کرتا ہے؛ لیکن کسی کے پاس زبان نہیں ہے اور کسی کے پاس قلم نہیں، امارت شرعیہ میں ہمارے رفیق کار آل

انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے آفس سکریٹری اور ہفت روزہ نقیب کے سب ایڈیٹر مولانا رضوان احمد ندوی ان خوش نصیب لوگوں میں ہیں؛ جن کو اللہ نے زبان وقلم کی دولت سے مالا مال کیا ہے، زبان وقلم کے ساتھ حساس دل ودماغ اور اخاذ ذہن نہ ہو تو بات نہیں بنتی، اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ان دونوں نعمتوں سے بھی انہیں وافر حصہ عطا کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے دماغ میں مضامین کی فصل لہلہاتی ہے، وہ جب اور جس وقت چاہیں نوک قلم سے اسے کاٹ کر قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں، کبھی کبھی تو ہم لوگوں کو احساس ہوتا ہے کہ مضامین کی آمد اتنی تیز ہے اور خیالات کی ترسیل اس کثرت سے ہو رہی ہے کہ قلم کی روانی ساتھ نہیں دے پا رہی ہے۔ فضل حق عظیم آبادی مرحوم نے بجا لکھا ہے کہ

''بزرگوں کی شفقت، دین اسلام سے رغبت اور امارت شرعیہ کے دینی ماحول میں شب وروز علماء کی صحبت نے ان کے پوشیدہ جواہر کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے'' (یادگار شخصیتیں:۳۰)

مولانا نے اپنی بائیس سالہ صحافتی زندگی میں کمیت کے اعتبار سے بہت لکھا ہے، مضامین کے انہیں مجموعوں سے ''راہ عمل'' کے دو حصے نیز افکار اور نظریات اور یادگار شخصیتیں چھپ کر قبول عام حاصل کر چکی ہیں اور جسے نائب امیر شریعت حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی، مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی، مولانا نیاز احمد رحمانی، فضل حق عظیم آبادی اور جناب عبدالرافع صاحب جیسے اساطین علم وفضل نے سراہا اور اثر آفرینی کو محسوس کیا ہے۔ مولانا کی چوتھی کتاب ''اسلامی معاشرہ'' ہے، جو دو باب پر منقسم ہے، پہلا باب ان مضامین ومقالات کے لیے مختص ہے، جو صالح معاشرہ کی تشکیل میں بنیاد واساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو نقیب کے مختلف شماروں میں شائع ہو کر قارئین سے داد تحسین وصول کر چکے ہیں، دوسرا باب ریڈیائی تقریروں پر مشتمل ہے، جو ہوا کے دوش پر سوار اصلاح معاشرہ کی غرض سے لوگوں کے گوش گزار کئے گئے۔

مولانا نے اس کتاب میں جو کچھ پیش کیا ہے اور جو اس کے مندرجات ہیں، وہ ''بھٹکے ہوئے آہو کو سوئے حرم'' لانے کی شعوری کوشش ہے، مولانا نے اپنی کتاب میں جگہ جگہ ان حقائق کو پیش کیا ہے، جس کے بغیر اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا، عنوانات کے اعتبار سے ان میں بڑا تنوع ہے، لیکن ماحصل سب کا یہی ہے کہ تڑپتی اور سسکتی انسانیت کو آج جس تریاق کی ضرورت ہے، وہ صرف اور صرف

اسلام کے پاس ہے۔ اس کے لیے انہوں نے جا بجا اسلامی تاریخ سے مدد لی ہے اور اسلامی تعلیمات کو اپنی نگارشات کا عنوان بنایا ہے۔

مولانا کی تحریر رواں، شگفتہ اور فکر سلیم ہے، سیدھے سادے جملوں میں وہ بڑی باتیں کہہ ڈالتے ہیں، اور اس کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ کم پڑھا لکھا آدمی بھی ان کی نگارشات سے پورے طور پر مستفید ہوتا ہے اور اسے اپنی عاقبت بنانے کی فکر دامن گیر ہو جاتی ہے۔ میری دعا ہے کہ مولانا کی یہ کتاب بھی دوسری کتابوں کی طرح مقبول ہو اور اس کا نفع عام وتام ہو۔ آمین

(۱۴/ ربیع الاول ۱۴۳۳ھ - ۱۸/ فروری ۲۰۱۲ء)

اسلام میں عورتوں کا مقام اوران کے حقوق

اس وقت مغرب اپنے اعیان ورفقاء کے ساتھ اسلام کے بارے میں جوغلط فہمیاں پیدا کررہا ہے،ان میں ایک اہم موضوع اسلام میں عورت کے مقام،ان کے حقوق، پردہ اورآزادئ نسواں کا ہے۔کوشش یہ کی جارہی ہے کہ ہرسطح پر یہ ثابت کیا جائے کہ اسلام حقوق نسواں کا قائل نہیں ہے اور وہ عورتوں کو محبوس کر کے رکھنا چاہتا ہے،وہ عورتوں کو ملازمت کی اجازت نہیں دیتا،اورانہیں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے سے روکتا ہے اوراس معاملہ میں اس اصول پر عمل کیا جارہا ہے کہ جھوٹ، اتنی بار بولو کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے اور یہ وہ لوگ کررہے ہیں جنہوں نے عورتوں کو سربازاررسوا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، ماچس کے ڈبے سے لے کر بڑی بڑی مصنوعات کے پیکٹ اوراشتہارات میں عورتوں کو نیم برہنہ بلکہ برہنہ پیش کیا جاتا ہے،مقابلہ جسم ڈھانکنے کا نہیں کرایا جاتا،جسم کھولنے کا کرایا جاتا ہے اور مقابلۂ حسن میں وہ عورت کامیاب ہوتی ہے جوزیادہ سے زیادہ بے شرمی، بے حیائی، فحاشی اورعریانیت کا مظاہرہ کرسکے،کلبوں،رقص گاہوں اور پارکوں میں اس کے جسم کی نمائش ہی نہیں ہوتی،اسے غیر مردوں کے بانہوں میں ڈال کر جسمانی عیاشی اور تفریح کا سامان بہم پہونچایا جاتا ہے۔اس کے علاوہ مرد اپنی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے خوش حال اور معیاری زندگی کے خواب دکھا کر اسے کسب معاش میں لگا دیتا ہے،اس کی کمائی پر گذراوقات کرتا ہے،خود دفتر سے آکر آرام کرتا ہے اور عورت دفتر سے آکر چولھا چکی اور خوردونوش کی تیاری میں لگ جاتی ہے،بچہ رورہا ہے تو اسے بھی دیکھنا عورت کی ذمہ داری ہوتی ہے،گویا صنف نازک پر تین ذمہ داری ڈال دی جاتی ہے۔وہ کمائے بھی،پکائے کھلائے بھی اور بچوں کی پرورش وپرداخت بھی کرے، یہ معاملہ عورتوں کی آزادی کا نہیں،سیدھا سیدھا عورتوں پر ظلم کا ہے،اورعورتیں اپنی آزادی کے خوش کن اور دل فریب نعروں کے سہارے یہ سب کررہی ہیں، جونوکری نہیں کرتیں وہ ملازمت پیشہ عورتوں کو خوش نصیب سمجھتی ہیں، جوملازمت کر رہی ہیں وہ اس دلدل میں اس قدر پھنس چکی ہیں کہ ''نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن'' کا معاملہ ہے۔

عورتوں کی اس صورت حال پر ایک تحقیقی مقالہ اورسروے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ''خواتین کے لئے

ان کی نوکری کسی جنگ کے مورچے پر تعینات ہونے سے کم نہیں ہے، یہ ایک ایسی جنگ ہے جہاں پریشانیاں دفتر سے لے کر گھر تک ان کا پیچھا کرتی ہیں۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سب سے تشویشناک بات یہ ہے کہ ۵۱ فیصد ملازمت پیشہ خواتین ذہنی بیماریوں کا شکار ہیں۔اگر اس کا مزید تجزیہ کریں تو ۲۱ سے ۳۰ سال کی عمر تک نوکری پیشہ خواتین میں ۶۳ فیصد ذہنی بیمار تھیں جبکہ ۳۱ سے ۵۶ سال تک کی عمر کی خواتین میں ۴۰ فیصد ذہنی بیمار پائی گئیں ۔
(http:www.patrika. com /news. aspx?id=25618)

ان حالات کا تقاضہ ہے کہ عورتوں کو ان کے میدان عمل میں ہی رہنے دیا جائے اور مغرب کی طرف سے پھیلائی جارہی بے بنیاد باتوں کا مدلل جواب دیا جائے ،ہمیں خوشی ہے کہ اسلام کے تعلق سے جوغلط فہمیاں پیدا کی جاری ہے اورعورتیں جس غلط فہمی کا شکار ہورہی ہیں اس کو دور کرنے کے لئے استاذ الاساتذہ حضرت مولانا نورالحق رحمانی مدظلہ نے قلم اٹھایا اوراس موضوع کے تمام گوشوں پر سیر حاصل بحث کیا ہے، انہوں نے اسلام میں عورتوں کے مقام،ان کے حقوق، دائرۂ عمل، خواتین کی ملازمت، مرد کی قوامیت، عورت کی شہادت اور وراثت، تعدداز دواج، پردہ کی حکمت واہمیت سب پر تفصیلی گفتگو فرمائی ہے اور حق یہ ہے کہ حق ادا کردیا ہے، مولانا بڑے عالم دین، صاحب طرز ادیب، بہترین مقرر ہیں، ان کی زبان اور قلم دونوں زمانۂ دراز سے احقاق حق اور دعوت دین کے کاموں میں سرگرم ہے، ان کی بہت ساری کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، ان کی تحریروں میں سادگی اور برجستگی پائی جاتی ہے، ان کی نثر رواں اور شستہ ہوتی ہے، جس سے معاملہ ''از دل خیزد بردل ریزد'' کا مصداق بن جاتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ مولانا موصوف کی یہ کتاب جوعورتوں کے مسئلے پر اسلام کی صحیح ترجمانی کی غرض سے منصۂ شہود پر آرہی ہے، ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی اوراس کا افادہ عام وتام ہوگا، اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ مصنف کی اس عظیم خدمت کو قبول فرمائے اور اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے۔آمین **یا رب العالمین. وصلی اللہ تعالیٰ علی البنی الکریم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین .**

حجاب کے فوائد اور بے حجابی کے نقصانات

آج سماج ومعاشرہ میں بے حیائی، فحاشی اور عریانیت نے جس قدر راہ پالیا ہے، اس کی بڑی وجہ ستر وحجاب کے سلسلہ میں اسلامی احکام کی ان دیکھی ہے، مغرب نے آزادیٔ نسواں کے نام پر عورتوں کو گھر سے باہر نکالا، حجاب اور پردہ کو دقیانوسی قرار دے کر ایسا پروپیگنڈہ کیا کہ عورتوں کو حجاب قید وبند نظر آنے لگا، چنانچہ وہ بے محابا بازاروں، گلیوں، کوچوں اور حد یہ کہ کوٹھوں کی زینت بننے لگیں، انہوں نے صرف حجاب نہیں اتارا، وہ مادر وپدر آزاد ہوگئیں، اس آزادی کے نتیجے میں ان کی عریاں تصویریں ماچس کے ڈبے سے لے کر بڑی بڑی مصنوعات کے پیکٹوں پر چھپنے لگیں، عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں وہ مردوں کی اس سازش کو نہ سمجھ سکیں کہ مردوں نے اپنی تفریح طبع اور آنکھ سینکنے کے لیے انہیں چادر اور چہار دیواری سے نکالا ہے، وہ عورتوں کا ہاتھ بچوں کی ولادت اور دودھ پلانے میں تو نہیں بٹا سکتا، مگر روزی روٹی کے حصول میں مردوں نے عورتوں کو اپنا شریک وسہیم بنالیا، اب عورت گھریلو ذمہ داری بھی ادا کرتی ہے، نسل کی بقا کا بوجھ بھی اس پر ہے اور دن بھر آفس میں غیر مردوں کی نگاہوں کا نشانہ بنتی ہے اور گھر جب تھکی ماری آتی ہے تو گھر کا کچن اس کا انتظار کر رہا ہوتا ہے، اس طرح آزادی کے نام پر عورتوں کے استحصال کا سلسلہ دراز ہوتا جا رہا ہے۔

اسلام نے آزادی نہ مردوں کو دی نہ عورتوں کو، دونوں کو احکام الٰہی کا پابند بنایا، صنفی رجحانات کے پیش نظر ان کی ذمہ داریاں الگ الگ قرار دیں، دونوں کے حقوق مقرر کیے اور دونوں کو فرائض بھی سونپے اور اس قدر حقوق دیئے کہ دوسرے مذاہب میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، دونوں کی خدمت کا دائرہ کار مقرر کیا، مرد کو نفقہ کے حصول کے لیے تگ ودو کا مکلّف بنایا اور عورتوں کو بچوں کی پرورش وپرداخت، شوہر کے مال کی نگہداشت اور امور خانہ داری کی انجام دہی کا ذمہ دیا۔

عورتوں نے اس تقسیم کو پسند نہیں کیا اور وہ مردوں کے محاذ میں جا گھسیں اور یہ بات بھول گئیں

کہ یہ محاذ ان کی صنفی صلاحیتوں کے اعتبار سے قطعاً غیر مناسب ہے وہ گھر کے ماحول کو اسلامی رکھ کر اور بچوں میں غیرت اسلامی پیدا کر کے انہیں مجاہد بنانے کے لیے جدوجہد کر سکتی ہیں، لیکن وہ مجاہد بنانے کے بجائے خود میدان کارزار میں کودنا چاہتی ہے، اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ کسی اسلحہ ساز کمپنی کو محاذ پر لے جا کر رکھ دیا جائے تو یہ کمپنی میدان کارزار میں کیا کرلے گی، بلکہ ہوسکتا ہے اس کی حفاظت کی جدو جہد میں جیتی جنگ بھی ہار میں بدل جائے، ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ عورت خود مجاہدہ نہیں؛ بلکہ وہ مجاہد پیدا کرنے کا کارخانہ ہے اور جب سے اس کارخانہ نے اپنا یہ کام چھوڑ دیا، مجاہد کی تعداد گھٹتی چلی گئی۔

آزادی کے نام پر عورتوں کا ایک طبقہ تو وہ ہے جس نے حجاب اتار پھینکا ہے، اور ان کا خیال ہے کہ نقاب لگانے سے مردوں کی نگاہ اس طرف زیادہ اٹھتی ہے، حضرت تھانویؒ کے ایک خلیفہ صوفی عبدالرب تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ چلو حجاب اتار دو، اب جو لوگ گھوریں گے تو کون کون سے کپڑے اس ڈر سے اتاروگی۔

عورتوں کی ایک جماعت وہ ہے جس نے حجاب کو بے حجابی کا ذریعہ بنا رکھا ہے، ایسا پرکشش، اعضا کے سارے ابھار کو نمایاں کرنے والا نقاب پہنتی ہیں کہ خواہی نخواہی آنکھیں اٹھ جاتی ہیں، یہ کاسیات عاریات کی قبیل سے ہیں، اور دعوت گناہ کی مرتکب ہیں۔ ماضی قریب کے بڑے مشہور بزرگ حضرت مولانا حکیم محمد اختر صاحب بار بار فرماتے تھے کہ آؤٹ لک (Out Luck) پر اگر نگاہ ٹک گئی تو ان پٹ (In Put) تک پہنچنے کی خواہش جوان ہوجاتی ہے۔ اس لیے شریعت نے ہر دو کو غض بصر کا حکم دیا بلکہ عورتوں سے پہلے مردوں کو حکم دیا کہ وہ غض بصر کریں اور شرمگاہ کی حفاظت کریں۔ حضرت حکیم صاحب کبھی یہ بھی فرماتے کہ اگر کسی نے اوپری منزل پر جگہ بنالی، تو گراؤنڈ فلور تک پہنچنے سے اسے روکا نہیں جاسکتا، اس جملہ کی معنویت پر جتنا غور کریں گے، غض بصر اور حفظ فروج کی معنویت اتنی ہی واضح ہوجائے گی۔

ہر دور میں اکابر علماء نے اس کی اہمیت کو سمجھا ہے اور بڑی وقیع کتابیں اس موضوع پر اسلامی لائبریری میں موجود ہیں، ماضی قریب کے بزرگ عالم دین اور ہمارے استاذ حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی کی کتاب ’’اسلام کا نظام عفت وعصمت‘‘ اہل علم اور اہل تحقیق میں بہت مقبول رہی ہے۔

لیکن ضرورت ختم نہیں ہوتی ہے،ضرورت ہے کہ بار بار اس موضوع پر بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں لکھا جائے،اور بھر پور لکھا جائے،تاکہ تذکیر کا کام مکمل طور پر انجام پا سکے،مجھے خوشی ہے کہ عزیز مکرم مولانا مفتی محمد نیر اسلام صاحب نے جن کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں،اور جنہیں ان موضوعات پر لکھنے کا اچھا سلیقہ ہے،حجاب اور بے حجابی کے نقصانات پر تفصیلی اور تحقیقی کتاب مرتب کی ہے،اس کام میں ان کے معاون ان کے شاگرد مولوی محمد ساجد سجادی سمستی پوری رہے ہیں،مولوی محمد ساجد سجادی گاہے گاہے مجھ سے بھی دعا لیتے رہے ہیں،اس لیے فطری طور پر ان کی معاونت ومساعدت کا جان کر خوشی ہوئی،اللہ انہیں اس کام کا ذوق وافر دے۔میں فرصت کی کمی اور مشغولیت کی فراوانی کی وجہ سے حرفاً حرفاً پوری کتاب تو نہیں دیکھ سکا،لیکن جس قدر دیکھ سکا،اس سے اس کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ ہوا،اللہ کی ذات سے امید ہے کہ مفتی صاحب کی یہ تالیف سماج ومعاشرہ میں بڑھتی ہوئی بے حیائی اور بے حجابی کو روکنے میں معاون ہوگی اور مؤلف عنداللہ ماجور اور عندالناس مشکور ہوں گے۔

(۱۲/۴/ ۱۴۳۵ھ-۲۹/۹/ ۲۰۱۴ء)

مقبول بندوں کے اوصاف

دنیا کی زندگی چندروزہ ہے،ابتلاء وآزمائش،مصائب ومشکلات سے بھری ہوئی ہے،کہیں رہیے اور کسی کام سے لگیے،مسائل آپ کا پیچھا کریں گے،اور مشقتیں آپ کے پہلو بہ پہلو چلیں گی،اس لیے اس دنیا کو دار المحنۃ والفرار کہا گیا ہے،اس کے مقابل آخرت کی زندگی ہے جو دائمی ہے اور ہمیشہ ہمیش کے لیے ہے،اسی لیے عقبٰی کو دار القرار کہا گیا ہے۔

دار القرار اور آخرت میں جو کچھ ملے گا،اس کے لیے فصل اس دنیا میں لگانی ہے،کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے،یہاں خیر وشر کے بیج دل کی کھیتی میں اگتے ہیں،نفسانی خواہشات،وساوس اور شیطان کی جد وجہد سے شر کے پودے جلد لہلہاتے ہیں اور تیزی سے برگ وبار لاکر دنیا کو شر وفساد کی آماج گاہ بناتے چلے جارہے ہیں،انسان،شیطان کا آلۂ کار بنتا چلا جارہا ہے،اور اس کے اثرات سے دنیا جہنم بنتی جارہی ہے۔عباد الشیطان کی بڑھتی ہوئی تعداد نے عباد الرحمٰن کے طور پر زندگی گذارنا مشکل ترین بنادیا ہے۔

ایمان والے ان حالات سے گھبراتے نہیں ہیں،وہ صبر وشکر کا سہارا لیتے ہیں اور خیر کے راستے پر بڑھتے جاتے ہیں،انہیں یقین ہے کہ غلبہ اللہ کی پکار کو ہی حاصل ہے جو ہر دور ہر زمانے اور ہر پل دار السلام کی طرف بلا رہا ہے،اور اس نے اپنی رحمت وبرکت،مدد ونصرت کے دروازے ایمان والوں کے لیے کھول رکھے ہیں،اور جنت ان کے انتظار میں ہے،جہاں وہ سب کچھ میسر ہوگا جس کی انسان خواہش کرے گا،ارشاد باری ہے: **وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ.**

اس اخروی نعمت اور ابدی جنت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ بندہ اللہ کا مقبول اور محبوب بندہ بن جائے،یہ مقبولیت اور محبوبیت کا مقام کس طرح حاصل ہوگا،اس کے لیے قرآن کریم میں واضح

ہدایات موجود ہیں، کامیابی کس طرح حاصل ہوگی؟ رحمٰن کا بندہ کس طرح بنا جاسکتا ہے؟ اس کے ظاہری اور باطنی اوصاف کیا ہونے چاہیے؟ سب کچھ قرآن کریم میں مذکور ہے، جس کے اجمالی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدیت، تواضع، عفو ودرگذر، شب بیداری، دعاء سحر گاہی، فکر آخرت، اخراجات میں اعتدال، ناحق قتل اور زنا سے احتراز، لغویات اور جھوٹی گواہی سے اجتناب، سنجیدگی اور شرافت، آیات قرآنی کی طرف توجہ کا اہتمام، اہل وعیال کی اصلاح کی فکر، خشوع خضوع کے ساتھ نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی، شرم گاہوں کی حفاظت، ایفاء وعدہ، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک دونوں جہاں میں کامیاب بنانے والے اللہ کے مقبول بندوں کے اوصاف واعمال ہیں، انسان جس قدر ان امور پر عمل پیرا ہوگا، اور اپنی زندگی میں داخل کرے گا، اسی قدر وہ اللہ کے قریب ہوتا چلا جائے گا۔ حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں متعلقہ آیات کی تفسیر میں ان امور پر شرح وبسط سے روشنی ڈالی ہے، اور اس انداز میں لکھا ہے کہ وہ مستقل رسالہ کے طور پر شائع کیا جاسکتا ہے۔

پڑھا ہم میں سے بہتوں نے ہے؛ لیکن ان افادات پر مشتمل رسالہ مرتب کرنے کا خیال ہم میں سے کسی کو نہیں آیا، عزیز گرامی قدر مفتی نیر اسلام استاذ دار العلوم الاسلامیہ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ جو نئی نسل کے موفق علماء میں ہیں، ان امور کی طرف ان کا ذہن منتقل ہوا، اور انہوں نے مقبول بندوں کے اوصاف پر ان افادات کی روشنی میں پوری کتاب مرتب کردی، اور ہم سب کی جانب سے شکریہ کے مستحق ٹھہرے۔ ہمارے لیے آسان ہوگیا کہ اپنی زندگی کو ان اوصاف کا حامل بنائیں تاکہ ہم جنت میں جانے کے قابل ہوجائیں واللہ الموفق وھو المعین۔

☆☆☆☆

ملفوظات مفتیٔ اعظم پاکستان

اہل اللہ کے احوال وآثار، واقعات وحوادثات، اقوال وملفوظات، انسانی زندگی میں صالحیت کے ساتھ صلاحیت کے فروغ میں کیمیا کی طرح ہیں، ان کے مطالعہ سے شخصیت بنتی ہے، ذہنی ارتقا ہوتا ہے، آخرت کا خوف پیدا ہوتا ہے اور دل کی دنیا بدلتی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ قصص نبوی اور سابقہ امتوں کے احوال پر مشتمل ہے، طاغوتی طاقتوں کی شکست وریخت کے ذکر سے عبرت وموعظت کا سامان فراہم کیا گیا ہے، اپنی تاثیر کے اعتبار سے قرآن کریم نے بعض قصے کو احسن القصص کہا ہے۔

انسان کی زندگی مکمل ایک کہانی ہے، پیدائش سے لے کر موت تک کے احوال یکے بعد دیگرے ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں، اور حسب صلاحیت ہم ان سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور اپنے لیے نصیحت اور عبرت کا سامان پالیتے ہیں، بہ قدر ظرف ہر قدح خوار اس سے متمتع اور مستفیض ہوتا ہے۔

زندگی کی یہ کہانی مکالمات اور ملفوظات کے بغیر مکمل نہیں ہوتی، آدمی اپنی بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے گفتگو کرتا ہے، بولتا ہے، یہ گفتگو بولنے والے کی ذات، علم، صلاح، تقوی، مشغولیات اور حیثیت عرفی کے اعتبار سے متنوع ہوا کرتی ہے، ان سب میں مضامین ومقالات کی طرح منصوبہ بندی نہیں ہوتی، یہ باتیں عموماً حوالوں سے بے نیاز ہوتی ہیں، لیکن ان میں صاحب ملفوظ کی زندگی اچھلتی، کودتی، چلتی، پھرتی اور مچلتی نظر آتی ہے، ان کی زندگی کی خواہش، کام کا میدان، کامیابیاں، ناکامیاں، صحیح اور غلط فیصلے اور اس کے عواقب ونتائج کو اس کے ذریعہ جانا، پرکھا اور جانچا جاسکتا ہے، اس کی روشنی میں زندگی بنائی جاسکتی ہے اور بُرے نتائج سے بچا جاسکتا ہے۔

ان ملفوظات کی اہمیت وعظمت اصلا صاحب ملفوظ سے ہوتی ہے، یقیناً عوام کی زندگی میں بھی ہمارے سیکھنے اور سمجھنے کے لیے بہت کچھ ہوتا ہے؛ لیکن ان کی زندگی میں علمی گہرائی اور گیرائی نہیں ہوتی،

خوف خدا اور فکر آخرت کا وہ عنصر نہیں ہوتا جو ہمارے دلوں میں محبت خداوندی کے چراغ روشن کر سکے؛ کیوں کہ یہ آگ لگتی نہیں، لگائی جاتی ہے۔

ماضی قریب میں حضرت تھانویؒ کی روشن اور اسلامی زندگی سے جن حضرات نے فیض حاصل کر کے اپنے کو مرشد کامل کی ذات گرامی سے مطابقت اور مماثلت پیدا کر کے ممتاز کیا اور حضرت تھانویؒ کی فکر کی ترویج واشاعت میں اپنی زندگی کھپا دی، ان میں ایک بڑا نام مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا ہے، جب تک ہندوستان میں رہے، خانقاہ تھانوی کے طرز پر خدمت انجام دیتے رہے، درس وتدریس، تقوی طہارت، صلاحیت وصالحیت، انابت الی اللہ میں ممتاز رہے، پاکستان جانے کے بعد ان کے جوہر اور کھلے، اور انہوں نے ”پاکستان کا مطلب ہے کیا؟ لا الٰہ الا اللہ“ کے نعرہ کو عملی شکل وصورت دینے کی بے پناہ جدوجہد کی، یقیناً یہ نعرہ پاکستان کے بعض داخلی حالات کی وجہ سے برگ وبار نہ لا سکا، اور علماء کے ایک بڑے طبقے کو اس سلسلہ میں مایوسی ہی ہاتھ لگی، حضرت مفتی محمد شفیعؒ نے اس مایوسی کا مداوا حضرت نانوتویؒ کے طریقہ پر بڑے بڑے ادارے کے قیام کی صورت میں نکالا، اور ایسے رجال کار کی تیاری پر زور دیا جو مستقبل کے پاکستان کو ان خطوط پر لا سکے، جن کے لیے اکابر نے جدوجہد کی تھی، یہ کام ان کے ادارے سے آج بھی جاری ہے اور میرا احساس ہے کہ ادارہ اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے، اور حضرت کے لیے صدقۂ جاریہ اور مستقبل کے لیے پاکستان کی امید ہے۔

ہمارے مفتی نیر اسلام قاسمی صاحب جو المعہد العالی امارت شرعیہ کے تربیت یافتہ اور امارت شرعیہ ہی کے دارالعلوم میں تدریس سے وابستہ ہیں، اکابر دیوبند کی خدمات کو نئی نسلوں تک عصری اسلوب میں منتقل کرنے کا حوصلہ اور جذبہ رکھتے ہیں، تدریسی مصروفیات سے تھوڑا وقت نکال کر اس اہم کام کی انجام دہی میں لگے رہتے ہیں، ان کی کئی کتابیں مختلف موضوعات پر آ چکی ہیں، ان کی تازہ تصنیف ”ملفوظات مفتی اعظم پاکستان“ منصۂ شہود پر آ رہی ہے، تواضع، انکساری جو ان کی شخصیت کا جز ہے، اس نے یہ نام ان سے رکھوایا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ملفوظات سے زیادہ حضرت کے احوال وملفوظات، حیات وخدمات پر مشتمل ہے، اس میں نامور اکابر دیوبند شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا سید اصغر

حسینؒ، حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا اعزاز علیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے احوال وآثار بھی آ گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب اکابر کی حیات مستعار سے تیار ایسا مرقع ہے، جن کو پڑھ کر ہم بے اختیار کہہ اٹھتے ہیں۔

اولئك آبائي فجئني بمثلهم
إذا جمعتنا يا جرير المجامع

اس مرقع کو بار بار پڑھنا چاہیے اور ان اکابر کی ذات وصفات، درجات اور کمالات کو اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہی اس کتاب کی تالیف کا مقصد ہے۔

میں اس کتاب کی تالیف پر مولف موصوف کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اس کی نافعیت کو عام وتام کرنے کی دعا پر اپنی مختصر تحریر ختم کرتا ہوں، آمین یارب العالمین وصلی اللہ تعالی علی النبي الكريم وعلى آله وصحبه اجمعين

(۱۲/ رجب ۱۴۳۴ھ مطابق ۲۴/ مئی ۲۰۱۳ء یوم الجمعہ بعد الصلاۃ)

شیخ کا پیغام اہل مدارس کے نام

اللہ رب العزت نے انسان کومخلوقات میں شکل وصورت کے اعتبار سے ممتاز بنایا، قابل تکریم وتعظیم بنایااور خلافت ارضی کے منصب پر سرفراز فرمایا، اس منصب کے اعتبار سے اسے عالم کبیر بخشا گیا، خوداس کی ذات کوعالم صغیر بنایااور اس عالم صغیر کا کنٹرول روم ''دل'' کوقرار دیا، اسی کنٹرول روم کی صحت پر اس سے صادر ہونے والے افعال، اعمال اور اقوال کی صحت وفساد موقوف ہے،

"ألا وإن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله وإذا فسدت فسد الجسد كله ألا وهي القلب"

انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک رہتا ہے تو پورا جسم ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ بگاڑ کا شکار ہوتا ہے تو پورا جسم فاسد ہو جاتا ہے، جان لو وہ دل ہے۔ (بخاری شریف: ج۱/۱۳)

پھر یہ اعمال وافعال اسی کائنات میں صادر ہوتے ہیں اور خلیفۂ ارضی کی طرف سے صادر ہوتے ہیں؛ اس لیے اس کے اثرات سے کائنات فساد کا شکار ہو جاتا ہے۔ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''ظهر الفساد في البر والبحر بما كسبت أيدي الناس'' (سورہ روم: ۴۱) اس ارشاد کی روشنی میں اگر سماج کو فساد وبگاڑ سے پاک کرنا ہے تو دل کو ٹھیک رکھنا ہوگا؛ کیوں کہ اسی کی زندگی پر ساری زندگی موقوف ہے۔ شاعر نے کہا ہے ؎

زندگی زندہ دلی کا نام ہے ☆ مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

ایک اور صاحب کا خیال ہے:

دل زندہ تو نہ مرجائے ☆ زندگی عبارت ہے تیرے جینے سے

اس دل کو زندہ؛ بلکہ تصوف کی اصطلاح میں جاری رکھنے کا طریقہ ذکر اللہ ہے۔ ذکر کے مختلف طریقے رائج

ہیں اور تصوف کے سلاسل میں اعداد ومقدار کے ساتھ مذکور ہیں، میرے نزدیک ''ذکر اکبر'' نماز اور تلاوت قرآن کریم کا اہتمام ہے۔ دعاء ماثورہ اور ہر اعمال کے لیے احادیث میں مذکور دعاؤں کا اہتمام قلب کو جاری رکھتا ہے اور یہ احکام خداوندی ''اذكروا الله ذكرا كثيرا'' کی بہترین شکل ہے یہ اذکار چھوٹ جائیں تو دل مردہ ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسان روحانی امراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ کبر وخود پسندی، بغض وعداوت، حسد وغیبت، چغلی اور بدگمانی اس کے مظاہر اور دنیا سے محبت، آخرت سے غفلت اور حب مال وجاہ اس کے نتائج کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ یہ امراض اپنے ساتھ اختلاف وانتشار بھی لاتے ہیں اور خاندان، سماج، معاشرہ، ادارے، تنظیمیں، مدارس سبھی اس کی زد میں آجاتے ہیں۔

ہمارے اکابر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا مفتی محمود حسنؒ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے یہاں ذکر کی مجلسیں لگا کرتی تھیں اور یہ مجلسیں ایسی مؤثر ہوتی تھیں کہ تھانہ بھون کا دھوبی بھی خواہ کسی مذہب کا ہو ''ہاں چھی! ہاں چھی!'' کی جگہ ''اللہ اللہ'' کہا کرتا تھا اور پورا تھانہ بھون ذکر اللہ کے اثرات سے ''بقعۂ نور'' بنا ہوتا تھا۔ میری جن اکابر سے ملاقات رہی ان میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نوراللہ مرقدہ کو اس کے لیے بہت فکرمند پایا، وہ خود بھی ذکر کی مجلس سجاتے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے، ان کے نزدیک تمام داخلی وخارجی اختلاف وانتشار نیز فتنہ وفساد کا اصل سبب ذکر اللہ سے غفلت اور مدارس، مراکز، تنظیموں اور تحریکوں میں پیدا ہونے والے تمام مسائل اور مشکلات کا حل ذکر اللہ کی کثرت تھی، اس خیال کا انہوں نے مختلف موقعوں سے اظہار کیا اور مختلف حضرات کے نام خطوط بھی ارسال کیے۔

اس سلسلہ میں ایک خط مفتی اعظم پاکستان مفتی محمد شفیع صاحبؒ کو بھی حضرت نے لکھا: جس کو سرنامہ بنا کر دار العلوم الاسلامیہ امارت شرعیہ کے مؤقر استاذِ حدیث وادب مولانا مفتی نیر اسلام قاسمی نے فضائل ذکر، فوائد ذکر، لوازم ذکر، ذکر اللہ کے آداب وشرائط، اسبابِ اختلاف وانتشار اور ان کی شناعت وقباحت، تزکیہ کی ضرورت اور اس کے فوائد پر مفید رسالہ مرتب کیا ہے۔

مضامین، قرآن واحادیث، تشریحات وافاداتِ اکابر پر مشتمل ہیں۔ مفتی نیر اسلام اچھے مدرس، بہترین مقرر ہیں، تصنیف وتالیف کا اچھا ذوق ہے، ان کی دو کتابیں ''خطب ساحرة'' اور ''اچھے

اخلاق اپنایئے'' (جس کے مرتب مجیب الحق ضیاء موتیہاری ہیں) اشاعت پذیر ہوکر مقبول عام ہوچکی ہیں، اب یہ تیسری کتاب بڑے اہم موضوع پر آ رہی ہے۔ موضوع کا انتخاب خود ان کی صالحیت، صلاحیت کا ثبوت ہے۔ ایسے موضوع پر تالیف کا خیال مبارک ومسعود ہے اور اس سے دنیوی اور اخروی فائدے کی بجا طور پر توقع کی جاتی ہے۔

مفتی صاحب کی تحریر کا انداز بھی اکابر کے ذوق کے مطابق ہے، سچی بات اور سیدھا سادا انداز ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا صحیح مصداق، اللہ سے دعاء ہے کہ وہ اس کتاب کو قبول عام وتام عطا فرمائے اور مفتی نیر اسلام کو اسلام کا نیر تاباں بنادے۔ آمین (نزیل منجھیلی، پورنیہ، ۱۷/۴/۱۴۳۴ھ)

بہار کا پر بہار سفر

اللہ رب العزت نے انسانوں کو پیدا کیا، اسے بندگی کا شعور بخشا، صحیفے اور کتابیں بھیجیں، انبیاء ورسل بھیجے، بندوں کی ہدایات کا مکمل سامان بہم پہنچایا، یہ سلسلہ ہمارے آقا ومولا فخر موجودات سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم پر جا کر ختم ہوگیا، اب انبیا ورسل نہیں آئیں گے، کتابیں نہیں اتریں گی، دین مکمل ہوگیا، دعوت وتبلیغ کا کام باقی رہ گیا، اور اس کے لیے علماء کو روئے زمین کا چراغ بنا کر انبیاء کی وراثت سپرد کردی گئی، انبیاء کی وراثت مال ودولت نہیں، دینی فکر کی ترویج واشاعت ہے، بھٹکے ہوؤں کو صراط مستقیم پر گامزن کرنے کی مسلسل اور مربوط جد وجہد ہے، الحمد للہ یہ کام ہر دور میں تاریخی تسلسل کے ساتھ جاری ہے، اور انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا۔

اللہ سے بندوں کو قریب کرنے کی یہ جد وجہد زندگی کا لازمہ بن جائے اور عبادت، عادت بن جائے تو بندوں پر اسرار الٰہی کھلنے لگتے ہیں، اس اسرار کی لذت، کیف سرور کچھ اور ہوتی ہے، اسے دو آتشہ، سہ آتشہ بنانے والی چیز سنتوں کی پابندی، ذکر اللہ کی کثرت اور آہ سحر گاہی ہے، تکلفات وتصنعات سے پاک زندگی سے بہت سے قلوب روشن ہوتے ہیں، یہ وہ مرحلہ ہے جسے حدیث میں '' من كان لله كان الله له '' سے تعبیر کیا گیا ہے، یعنی جو اللہ کا ہو جاتا ہے، اللہ اس کا ہو جاتا ہے، اس کے ہر کام میں اللہ کی رضا شامل ہوتی ہے۔

ہمارے استاذ حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ اجل حضرت مولانا حسین احمد پانڈولوی سہارن پوری دامت برکاتہم کا شمار ان دنوں ایسی ہی برگزیدہ شخصیتوں میں ہوتا ہے، جن کی جد وجہد سے دین کی باد بہاری مختلف علاقوں میں چل رہی ہے، اور جن کی طرف ان دنوں لوگوں کا رجوع عام ہے اور خوب خوب فائدہ پہنچ رہا ہے۔

ابھی کچھ دنوں قبل حضرت کا سفر بہار کا ہوا تھا، جس کی تحریک اساتذہ دار العلوم الاسلامیہ

امارت شرعیہ مفتی نیر اسلام قاسمی، مفتی محمد عبید اللہ قاسمی اور مولانا عبد الماجد گیاوی (جو جماعت خانہ امارت شرعیہ کے امام اور قاضی نور الحسن میموریل اسکول امارت شرعیہ کے صدر مدرس ہیں) کئی سالوں سے کررہے تھے، بالآخران حضرات کی درخواست نے شرف قبولیت پالیااور ہم جیسوں کو بھی اس بہانے سے حضرت کی زیارت کی سعادت نیز بعض مجلسوں میں شرکت کی توفیق مل گئی، اور استفادے کا موقع نصیب ہوا، مندرجہ بالا تینوں حضرات کا اصلاحی تعلق حضرت سے قائم ہے، اور رمضان المبارک میں حضرت کے ساتھ ہی یہ حضرات اعتکاف فرماتے ہیں، ان حضرات میں ذوق لطیف بھی ہے اور شوق فراواں بھی، اس لیے ان حضرات کی زندگی اور معمولات میں حضرت کی توجہات اور تربیت کے اثرات بھی نمایاں ہیں، اللھم زدفزد۔

ان حضرات نے اس سفر کو یادگار بنانے نیز حضرت کے ملفوظات، بیانات کو عام لوگوں تک پہنچانے کے لیے اس سفر کی روداد بھی مرتب کرنے کا اہتمام کیا، عزیزم مجیب الحق ضیا متعلم دار العلوم الاسلامیہ نے بھی حسب سابق اس کام میں معاونت کی اور الحمدللہ ''بہار کا پر بہار سفر'' کے نام سے کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کتاب کا تقریبا نصف حصہ اس سفر کی روداد، حضرت دامت برکاتہم کی خصوصیات، تصوف سے شغف اور اس کی اہمیت پر مشتمل ہے، یہ حصہ مفتی نیر اسلام کے قلم سے ہے اور خوب ہے، اس مضمون کے ہر سطر بلکہ ہر لفظ سے وارفتگی، شیفتگی نیز قلبی تعلق کا اظہار ہوتا ہے، بعض جگہ تو ادبی انداز میں قلم وجد کرنے لگا ہے، بہت سارے اشعار بھی مضمون میں نگینے کی طرح جڑے ہوئے ہیں، مفتی صاحب کی دیگر تحریروں سے یہ تحریر آمد، برجستگی اور بے ساختگی میں ممتاز ہے، اشعار کے استعمال اور اسلوب نے تصوف جیسے خشک موضوع کو دلچسپ بنا دیا ہے اور قاری مکمل مطالعہ کے بغیر کتاب رکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔

کتاب کا دوسرا حصہ حضرت کی مجلسوں کی تفصیلات اور حضرت کے مواعظ و ملفوظات پر مشتمل ہے، اس کا ایک حصہ مفتی عبید اللہ قاسمی استاذ دار العلوم الاسلامیہ امارت شرعیہ کے ذریعہ ضبط تحریر میں آیا ہے، جو گیا کی مجلسوں کے ذکر پر مشتمل ہے، مفتی صاحب کی یہ کوشش قابل قدر اور لائق تحسین ہے، پٹنہ کے روداد کی ترتیب مفتی نیر اسلام اور ان کے شاگرد مجیب الحق صاحب نے کیا ہے، اسے پڑھ کر حضرت

کے وسیع علم، تجربات اور دعوت کے حکیمانہ انداز کا ادراک ہوتا ہے، لوگ حاجیوں سے کیا کیا امیدیں رکھتے ہیں؛ لیکن حضرت ایک عازم حج سے فرماتے ہیں میرے لیے ڈاڑھی لیتے آئیو، کیسا بلیغ انداز ڈاڑھی رکھنے کی طرف متوجہ کرنے کا ہے، اس قسم کی مثالیں اس کتاب میں اور بھی ملیں گی۔ موقع کی مناسبت سے حضرت کی یہ تقریریں اور ملفوظات ''از دل خیزد بردل ریزد'' کی صحیح مصداق ہیں، کتنے مردہ قلوب نے اس بیان سے روشنی پائی اور کتنے بھٹکے ہوؤں نے راستہ پالیا، کتاب کی اشاعت سے یہ سلسلہ صدقۂ جاریہ بن جائے گا اور لوگوں کی اصلاح اور قربت الٰہی کا انشاء اللہ ذریعہ ہوگا، اس کام کے لیے مرتبین، ہم سب کی جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں، اللہ تعالی ان سب کو بہتر اجر عطا فرمائے اور اس کتاب سے لوگوں کو خوب خوب فائدہ پہنچے، **آمین یا رب العلمین وصلی اللہ علی النبی الکریم وعلی آلہ وصحبہ اجمعین**

(۲/ ذیقعدہ ۱۴۳۵ھ مطابق ۲۹/ اگست ۲۰۱۴ء)

امیر شریعت خامس کی منظوم سوانح

امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب (م ۲۹/ستمبر ۱۹۹۸ء) اپنے وقت کے بافیض صاحب نسبت بزرگ تھے، تواضع، انکساری، خلوص وللّٰہیت اور اخفاء حال کے الفاظ لغت میں پڑھے ضرور؛ لیکن ان کا مصداق اور مفہوم حضرت کو دیکھ کر سمجھ میں آیا، امارت شرعیہ کے لیے ان کی خدمات کا زمانہ طویل بھی ہے اور ناقابل فراموش بھی، ان کی ہمہ جہت صلاحیت امارت کے لئے وقف تھی، نائب امیر شریعت کی حیثیت سے بھی اور امیر شریعت کی حیثیت سے بھی، ان کی دعائے نیم شبی اور آہ سحر گاہی نے امارت شرعیہ کی خدمات کو عام کرنے اور لوگوں میں اعتبار اور اعتماد قائم کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

مولانا وصی احمد شمسی حضرت امیر شریعت خامس کے داماد ہیں، لکھتے بھی ہیں، بولتے بھی ہیں، سوچتے بھی ہیں اور سب سے بڑھ کر کچھ کر گزرنے کا جذبہ رکھتے ہیں، جذبہ کیا، سوچتے ہیں، کر گزرتے ہیں، حضرت امیر شریعت خامس کی صحبت سے ان کے اندر صالحیت اور صلاحیت پیدا ہوئی اور اللہ کے فضل نیز اس کی توفیق سے اس کا وہ پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں، امارت شرعیہ سے ان کا تعلق بھی قدیم ہے، اور محبت ان کے جسم میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

اس محبت کے طفیل ان کی آمد ورفت امارت شرعیہ کے علاوہ بڑے تعلیمی اداروں اور تنظیموں میں ہوتی رہتی ہے، صلے کی تمنا اور ستائش کی پرواہ کیے بغیر اپنے صرفہ سے لمبے لمبے اسفار کرتے ہیں، مقصد جائزہ بھی ہوتا ہے اور سیکھنے کی خواہش بھی، ایسا ہی ایک سفر انہوں نے جامعہ اشاعت العلوم اکل کواں کا کیا، اور مولانا غلام وستانوی کی خدمات سے متاثر ہو کر لوٹے۔

اسی سفر میں مولانا ولی اللہ بستوی سے ملاقات ہوگئی، اہل اللہ کا ذکر نکلا تو بات حضرت امیر شریعت خامس تک پہنچی اور مولانا ولی اللہ بستوی صاحب کو متاثر کر گئی، مولانا قادر الکلام شاعر ہیں،

برجستہ فی البدیہ اشعار کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں، سادگی پرکاری نیز فن کی رعایت کے ساتھ ان کی شاعری دل ودماغ کو گرماتی ہے، بسیار گوئی نے ان کے فن کو نقصان نہیں پہنچایا ہے، جس کی عمدہ مثال حضرت امیر شریعت خامس پر لکھی، ان کی طویل نظم ہے، ایک سو اکتیس اشعار میں حضرت کی پوری سوانح نظم کرنا آسان کام نہیں ہے، مولانا نے یہ مشکل کام آسان کر دکھایا ہے، اور ایسا مرقع کھینچا ہے کہ دل ودماغ دونوں متاثر ہوتے ہیں، مولانا موصوف اس اہم کام کے لیے ہم سب کی جانب سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

اللہ رب العزت انہیں اس کا بہتر بدلہ عطا فرمائے، اور اس کتاب کو قبول عام وتام سے نوازے آمین

(۱۶/۴/۱۴۳۴ھ)

مولانا سید شمس الحق - حیات اور علمی و ادبی خدمات

بیسویں صدی کی تاریخ، جن حضرات کی علمی، ادبی، سماجی، مذہبی خدمات کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی اور جن کے تابندہ نقوش نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہیں، ان میں ایک اہم نام سابق شیخ الحدیث جامعہ رحمانی مونگیر حضرت مولانا سید محمد شمس الحق صاحب چک اولیاء، ابابکر پور، ضلع ویشالی کا ہے، جو ویشالی ہی نہیں بہار کے نامور سپوت، علم وعمل کے جامع، زہد وورع میں ممتاز، گفتار وکردار کے دھنی، انابت الی اللہ اور تواضع للہ میں ضرب المثل تھے، ان کے انتقال سے مسند ارشاد وتدریس سونی ہوگئی اور یہ سوناپن دور تک محسوس کیا گیا اور دیر تک محسوس کیا جاتا رہے گا، مولانا کی زندگی اسوۂ رسول ﷺ کا نمونہ تھی، اور اس حوالہ سے ان کی حیات وخدمات بعد والوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

لیکن زمانہ کا وطیرہ بدل گیا ہے، آج ہماری تحقیق کا مرکز وہ لوگ بن گئے ہیں جن میں سے بیش تر کی زندگی عمل سے بے نیاز ہوتی ہے، اور جن میں سے کئی کی زندگی کا امتیاز معصیت میں ممتاز ہوا کرتا ہے، زندگی نہ بولے تو فن پارے محض نعرے رہ جاتے ہیں اور فن کی اثر آفرینی میں کمی ہوجاتی ہے، اس کے برعکس اگر ان حضرات کی زندگی ہماری تحقیق کا موضوع بنے؛ جن کے یہاں ادب ہے، شاعری ہے، صلاحیت ہے، صالحیت ہے اور ان کی زندگی اخلاق حمیدہ اور اوصاف نیک سے عبارت ہے، تو فن بھی پاکیزہ ہوگا اور فنکار کی پاکیزگی ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا سبب بنے گی اور قاری کو پورے طور پر متاثر کرے گی۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی کی مسدس اور علامہ اقبال کے کلام کے زندہ رہنے کی یہی وجہ ہے، حالؔی کی مسدس پر قوم کے مرثیہ کی جتنی پھبتی کسی جائے؛ لیکن اس کی تاثیر اول روز کی طرح آج بھی قائم ہے اور اقبال کے کلام کو پڑھ کر ان کی فکر کی پاکیزگی عمل پر ابھارتی ہے اور کچھ کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں جوشؔ، فراقؔ، ساحرؔ لدھیانوی، فیض احمد فیضؔ کی شاعری کو لیں تو محسوس ہوگا کہ الفاظ کی بازیگری ہے۔ جوشؔ جوش دلا کر رہ جاتے ہیں ساحرؔ کے یہاں زندگی کی محرومیاں رقصاں ہیں،

فیضؔ، لینن اور مارکس کے سائے میں ہیں، پڑھ لیجیے، واہ واہ کر لیجیے، وقتی طور پر محظوظ ہو لیجیے اور بس۔ جگرؔ اور خمارؔ بارہ بنکوی کے دونوں دور کے اشعار پڑھیے تو آپ ہماری ان باتوں کی تائید کے لیے اپنے کو مجبور پائیں گے۔

یہی وہ احساسات تھے جس کی وجہ سے میں نے اپنے برادر عزیز محمد صباء الہدی صباء کو یہ مشورہ دیا کہ اپنے تحقیقی مقالہ کے لیے کسی ایسے عالم کا انتخاب کرو، جن کے یہاں ادب وشاعری پورے لوازمات کے ساتھ اور حیات وشخصیت پوری صالحیت کے ساتھ جلوہ فگن ہو؛ چنانچہ انہوں نے مولانا سید محمد شمس الحق کی حیات وعلمی وادبی خدمات کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور ڈاکٹر ممتاز احمد خان صاحب ریڈر شعبۂ اردو بی آر امبیڈکر بہار یونیورسیٹی مظفر پور کی نگرانی میں اپنا مقالہ مکمل کیا۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی اسلامی ادب کے غواص اور اسلامی افکار واقدار کے ترجمان ہیں، اس لیے انہوں نے اس موضوع کو پسند کیا اور مولانا کی ہمہ جہت شخصیت اور خدمات پر بھر پور مقالہ تیار ہوگیا، ممتحنین حضرات نے بھی اطمینان کا اظہار کیا اور الحمد للہ ڈگری ایوارڈ ہوگئی۔

عام طور پر پی ایچ ڈی (Ph.D.) کے مقالے چھپتے نہیں ہیں؛ کیوں کہ وہ تحقیق کے معیار پر پورے نہیں اترتے، اس لیے ڈگری ملنے کے بعد ریسرچ اسکالر اطمینان کی سانس لیتا ہے، اور ملازمت وغیرہ میں جو سہولیات ملتی ہیں اس کو پاکر قانع ہوجاتا ہے؛ کیونکہ ان دنوں پی ایچ ڈی کے مقالہ کی خصوصیت دفتیوں کے درمیان چند اوراق لکھے ہونے کی رہ گئی ہے۔ کئی دفعہ ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جس مقالے پر پہلے ڈگری ایوارڈ ہوچکی ہے، اس پر ٹائٹل بدل کر دوسری یونیورسیٹی سے ڈگری لے لی گئی، اور کام چل گیا، ایسے میں پی ایچ ڈی کے مقالہ کو چھپوانا عام طور پر اپنی رسوائی کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔

لیکن برادرم محمد صباء الہدی صباؔ کا معاملہ دوسرا ہے، انہوں نے جس محنت سے تحقیق کی ہے، موضوع کے مالہ وماعلیہ کو سمیٹا ہے اور جس طرح تحقیق کے تقاضوں کو برتا ہے اور اس خارزار وادی کو عبور کیا ہے، اس سے ان کے اندر ایک طرح کی خود اعتمادی پائی جاتی ہے اور انہیں اطمینان ہے کہ اس مقالہ کی اشاعت سے حضرت مولانا سید محمد شمس الحق کی حیات وخدمات لوگوں کے سامنے آجائیں گی اور اس

سے آنے والی نسلوں کو فائدہ پہنچے گا، ان کا خیال بجا، ان کی جرأت قابل داد اور ان کی تحقیق لائق ستائش ہے، انہوں نے اسلوب بھی علمی رکھا ہے اور ان کی نثر بھی پاکیزہ ہے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس مقالہ کو قبولیت سے سرفراز کرے اور علم و تحقیق کی دنیا میں محمد صباء الہدیٰ صبا خوب خوب ترقی کریں۔

آمین یارب العالمین وصلی اللہ علی النبی الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

مولانا ابوالکلام قاسمی-شخصیت اور خدمات

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی ہمہ جہت شخصیت اور علمی وادبی خدمات پر بیش قیمت مضامین ومقالات کا یہ حسین گلدستہ عزیز گرامی قدر مولانا صدر عالم ندوی مظاہری نے ترتیب دیا ہے، مولانا کے مخلصین، معتقدین اور متوسلین کے مقالات ہیں جو عزیزم صدر عالم سلمہ کی درخواست پر ان حضرات نے لکھے ہیں، ان کی یہ کوشش قابل ستائش ہے، اس کوشش کے نتیجے ہی میں ہم مولانا کی شخصیت اور خدمات سے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات سے واقف ہو رہے ہیں۔ کتاب کا ایک باب مولانا کے مضامین ومقالات پر مشتمل ہے اس سے ہم مخصوص مسائل میں مولانا کی فکر اور ان کے نظریات کو سمجھ سکتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام قاسمی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے وہ قاسمی اور شمسی دونوں ہیں، اس کا مطلب ہے کہ وہ قدیم صالح اور جدید نافع کے جامع ہیں، سیر وتواریخ ان کا پسندیدہ موضوع اور مدارس کے احوال وکوائف اس کے عروج وزوال کی داستان، نصاب تعلیم اور نظام مدارس ان کے فکر کا محور رہا ہے، سرکاری بندشوں کے باوجود ان کا قلم حق کی ترویج میں لگا رہا ہے، یہ اپنے میں بڑی بات ہے۔

مولانا ۳۱/ اکتوبر ۲۰۱۱ء کو اپنی طویل ملازمت اور خدمات سے سبکدوش ہو گئے ہیں اور کہنا چاہئے کہ چاندی کے وہ وطوق وسلاسل جس میں وہ اپنی علمی اور معاشی ضرورت کی وجہ سے قید تھے، اتر گئے ہیں، ایسے میں ہمیں امید ہے کہ ان کی فکر جو پہلے بھی آزاد تھی اور ان کا قلم جس پر قید وبند کے اثرات پہلے بھی کم پڑتے تھے، مزید حریت اور جرأت کے ساتھ ملت کی شیرازہ بندی، تعلیم کے فروغ اور حکومتی سطح پر غیر منصفانہ اقدام کے خلاف تیز رفتار ہوگا۔

دور دیش کا قصہ ہے کہ ایک سرکاری آدمی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوا، لوگ اس کو مبارک باد دے رہے تھے کہ اس نے ملازمت کی پوری مدت صاف ستھرے انداز میں گذار دی، اور بڑا کام کیا،

کہنے لگا، میاں! کام تو اب کرنا ہوگا، ریٹائر ہونے کے بعد، اب تک تو ملازمت ہوتی رہی ہے۔

مولانا نے زندگی کے مختلف ادوار میں ملازمت سے زیادہ کام ہی کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ سبکدوشی کے بعد صرف کام خصوصاً تحقیقی اور تصنیفی کام پر اپنی توجہ صرف کریں گے، علماء بہار کے طویل پروجکٹ کو مکمل کر کے اس علمی خلا کو پر کریں گے۔ جس کا انتظار تشنگان علوم کو برسوں سے ہے۔

صحت وعافیت اور درازی عمر کی دعا اپنے مقالہ میں پہلے بھی کر چکا ہوں اور پھر کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ ان کا سایہ تادیر قائم رکھے تاکہ وہ ملت کی بیش بہا خدمات انجام دے سکیں۔ آمین۔

مجلّہ قومی یکجہتی

دیکھتے دیکھتے شمیم صاحب کی چوتھی برسی آ گئی۔ اس موقع سے ایم شمیم جرنلسٹ سوشل ویلفیر میموریل کمیٹی نے قومی یکجہتی پر مجلّہ کے اجرا کا فیصلہ کیا اور ترتیب کے لیے قرعۂ فال بنام من دیوانہ نکل آیا، کمیٹی نے ایک فیصلہ لیا اور نائب صدر ہونے کے ناطے میں نے سر تسلیم خم کر دیا۔

شروع میں جب اس موضوع پر کچھ لکھنے کی بات آئی تو ذہن کسی طور آمادہ نہ ہوا، قرآن وحدیث اور سیر وتواریخ ابتدا ہی سے میرے پسندیدہ موضوع رہے اور انہی پر قلم تیز چلتا رہا؛ لیکن اس نئے موضوع پر کچھ لکھنے کے لیے جب بھی سوچا، قلم رک رک گیا، بھائی ہارون رشید صاحب سے کہا کہ وہ سیاسی حضرات سے رابطہ قائم کریں، اور ان کو اس وظیفہ پر کچھ لکھنے کو کہیں؛ جس کا ورد صبح وشام وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر کیا کرتے ہیں، لیکن نتیجہ اس کا بھی صفر ہی رہا، کچھ لوگوں سے میں ذاتی طور پر ملا، خیال تھا کہ وہ اس موضوع پر بہت اچھا لکھ سکتے ہیں، مگر تجربہ ہوا کہ ان کا مطالعہ اس موضوع پر بالکل نہیں ہے، اور انہیں الفاظ کی رٹ کے سوا کچھ نہیں آتا، بعضوں نے قومی یکجہتی کی افادیت سے انکار کر دیا، بعضوں نے ناک بھنو چڑھا کر کہا کہ ہم ہی کیوں اس کے لیے آگے آئیں؟ خلاصہ یہ کہ جتنے لوگ تھے، اتنی ہی باتیں تھیں، شمیم جرنلسٹ-حیات وخدمات کے موقع سے بھی تلخ تجربہ ہوا تھا؛ لیکن اب کے تو تلخ ترین ہو گیا، اس کے باوجود کمیٹی کا فیصلہ تھا کہ مجلّہ نکلے گا اور قومی یکجہتی پر نکلے گا۔ آپ جانتے ہی ہیں، بھائی ہارون رشید کس مٹی کے انسان ہیں، جب وہ فیصلہ کر لیتے ہیں تو اپنی جگہ سے ٹلتے نہیں، چاہے اس کے لیے انہیں جو کچھ نہ کرنا پڑے۔

ان حالات میں قومی یک جہتی کا مطالعہ میں نے بھی شروع کیا، اور اس پس منظر میں شروع کیا کہ برسوں سیاسی اور عوامی سطح پر متعدد ادارے اور انجمنوں کی محنت وکوشش کے باوجود قومی یک جہتی کا قیام اب تک کیوں نہ ہو سکا، بلکہ مختلف مقامات پر فسادات، تشدد، لاقانونیت، علاقائی ولسانی جھگڑے

اور مذہبی احیاء پسند تنظیموں کی کامیابیاں تو ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ قومی یک جہتی تو دور کی بات ہے ہم تو بڑی تیزی سے عدم یک جہتی کی طرف بڑھ رہے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ قومی یک جہتی کے لیے کوشاں تمام ادارے بری طرح ناکام ہو گئے ہیں، اس کا مطلب ہے کہ کہیں پر کوئی چوک ہم سے ہوئی ہے، جس کی وجہ سے ہماری کوششیں بار آور نہیں ہو رہی ہیں۔

جہاں تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہندوستان میں ہمہ جہت قومی یک جہتی کا تصور سرے سے غلط اور ناقابل عمل ہے، تحریک آزادی کے زمانہ میں ممکن ہے اس نعرہ نے کچھ ہلچل پیدا کی ہو؛ لیکن بدلتے ہوئے ماحول میں اب یہ کسی طور قابل عمل نہیں ہے، آج کے ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ ہم جس یک جہتی کا تصور کر سکتے ہیں، وہ صرف سیاسی اور جغرافیائی ہے، اس کے برعکس مختلف النوع لسانی، ثقافتی، مذہبی اور علاقائی طور پر یک جہتی کا تصور مجذوب کی بڑ اور دیوانے کی خواب کی طرح ہے، جو ممکن ہے سننے میں بھلے معلوم ہوں، لیکن نتیجہ یہی ہوا، ہو رہا ہے اور ہوگا کہ مختلف عصبیتیں انفرادی طور پر متحرک ہو جائیں اور ملک کی سلامتی پارہ پارہ ہو جائے۔

اب تک قومی یک جہتی کے نام پر جو کچھ ہوا ہے، وہ یہی ہے کہ اکثریتی فرقہ کی تہذیب وثقافت، زبان وتاریخ، تمدن وکلچر اور مذہب کو سرکاری ذرائع ابلاغ نے عام کیا ہے اور دستور نے اسے ملک کی زبان اور کلچر مان کر دیگر تہذیب اور زبانوں پر لاد دیا ہے اور اس کے بعد قومی یک جہتی کے نام پر دہائیاں دی جا رہی ہیں کہ سیکولرزم یہی ہے اور ہندوستان سے محبت کا ثبوت اسی کو پروان چڑھانے میں ہے۔

حکومتی سطح پر ایسی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اقلیتیں اپنی تہذیب وثقافت اور زبان وکلچر کو غیر محفوظ سمجھنے لگیں اور ان میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اگر ہم اپنے لسانی وثقافتی ورثہ کے تحفظ کے لئے آگے نہیں آئے تو ہمارا تشخص، ہماری انفرادیت ختم ہو کر رہ جائے گی اور ہم قومی دھارے میں نہیں ہندی تہذیب کے دھارے میں بہہ کر لاپتہ ہو جائیں گے۔

اس احساس کا نتیجہ لازمی طور پر انتہا پسندی کی شکل میں سامنے آیا، اور اس کے مضر اثرات آج ہندوستان کے ہر کونے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

اس لیے میری رائے یہ ہے کہ قومی یک جہتی پر کام کرنے والے مختلف ادارے، انجمنیں اور ہمارا ہندوستانی معاشرہ اگر اس معاملہ میں مخلص ہے تو اسے جتنی جلد ممکن ہو یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ ہندوستان یک قومی مملکت نہیں، صرف سیاسی مملکت ہے، یہاں مختلف نظریات کے لوگ بستے ہیں، اور نظریاتی طور پر ان کے درمیان ہم آہنگی کی شکل کسی طور ممکن نہیں، اگر کچھ کیا جا سکتا ہے تو صرف اتنا کہ اسے سیاسی مملکت قرار دیا جائے اور قومی یک جہتی کے بجائے سیاسی یا ملکی یک جہتی پر زور دیا جائے اس کی وجہ سے مختلف النوع طبقات میں تحفظ کا احساس پیدا ہوگا اور حب الوطنی کا جذبہ ان کے دلوں میں موجزن ہو جائے گا۔

دوسرا کام یہ کیا جائے کہ سرکاری ذرائع ابلاغ بالخصوص دوردرشن سے ہندو تہذیب کو گھر گھر پہنچانے کا جو عمل جاری ہے، اسے فی الفور بند کیا جائے تا کہ اقلیتیں یہ سمجھنے لگیں کہ سرکاری سطح پر ہماری تہذیب کو دبانے اور مسخ کرنے کی کوشش نہیں ہو رہی ہے، جس دن اقلیتوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا، ملکی یک جہتی کی ساری کوششیں اس دن بار آور ہو جائیں گی۔

لیکن یہاں تو عملاً یہ ہو رہا ہے کہ دیو مالائی روایت کو الہام اور حقیقت کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اور ٹیپو سلطان کے تاریخی کردار کو دوردرشن پر افسانہ کہہ کر، ایسے میں اگر اقلیتیں اکثریتی فرقہ کی تہذیب کے خلاف اپنے ثقافتی ورثہ کے تحفظ کے لیے کمر کس کر میدان میں آ جائیں تو کوئی سر پھرا ہی اس نفسیاتی رد عمل کو انتہا پسندی قرار دے گا۔

بہر کیف گفتگو لمبی ہوتی چلی گئی، قومی یک جہتی میرا موضوع تو ہے ہی نہیں، بس یونہی ذہن میں ایک بات آ گئی اور لکھتا چلا گیا، کہنا صرف یہ ہے کہ قومی یک جہتی پر جیسا مجلّہ ہم نکالنا چاہتے تھے ویسا نکل نہیں سکا، اس کے باوجود کئی اچھے مقالے اس مجلّہ کی زینت ہیں، مشہور نقاد اور اسلامی ادیب پروفیسر عبد المغنی صاحب نے انگریزی میں اس موضوع پر جو کچھ لکھ دیا ہے، وہ خوب ہی نہیں بہت خوب ہے، بھائی ہارون رشید صاحب کا مقالہ ''راجیو گاندھی اور قومی یک جہتی''، مختصر لیکن بہترین خراج عقیدت ہے، توقیر عالم نظمی اور عشرت پروین کی کاوشیں بھی اپنی جگہ بہترین اور قابل مطالعہ ہیں، ''اسلام میں قومی یک جہتی کی بنیادیں'' کے عنوان سے احقر کا بھی ایک مقالہ شریک اشاعت ہے۔

میں ان مقالات پر کچھ لکھنا نہیں چاہتا، پورا مجلّہ ہی پیش خدمت ہے، جو خوبیاں نظر آئیں وہ بھائی ہارون رشید صاحب کی سعیٔ مشکور کا نتیجہ ہیں کہ انہوں نے ہی دوڑ دھوپ کر مضامین حاصل کیے، کاتبوں کی نخوت کا سامنا کیا، پریس والوں کے یہاں دوڑتے رہے اور سب سے بڑھ کر اس کی طباعت وغیرہ کے اخراجات برداشت کیے، ان تمام محنتوں کے باوجود کچھ خامیاں آپ کے دیکھنے میں آ ہی جائیں گی، یہ سب میری کوتاہی اور کمزوری کا نتیجہ ہیں، آپ ان کو میرے نامۂ اعمال میں ڈال دیجیے۔

انجمن ترقی اردو ویشالی کی خدمات

بیسویں صدی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوئل میں اردو زبان وادب کے حوالہ سے انجمن ترقی اردو ویشالی نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ تاریخ کا روشن باب اور قلت وسائل کے باوجود تحریک کو بار آور کرنے کی روشن مثال ہے، ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، انوار الحسن وسطوی، ڈاکٹر مشتاق احمد مشتاق، ظہیر الدین نوری، مصباح الدین احمد انجمن ترقی اردو ویشالی کے ارکان خمسہ رہے ہیں، جنہوں نے اس تحریک کے خدوخال میں رنگ بھرنے کا کام کیا، راقم الحروف ثناء الہدیٰ قاسمی بھی گرد راہ اور غبار کارواں کے طور پر شریک رہا، اور اس مصاحبت کے نتیجے میں ادبی اور تنقیدی مضامین ومقالات لکھنے کی طرف طبیعت متوجہ ہوئی، واقعہ یہ ہے کہ میرے تمام ادبی مقالے اور تنقیدی مضامین اسی مصاحبت کی دین اور میری کتاب ''نقد معتبر'' اسی مصاحبت کی یادگار ہے۔

دور دراز کے دیہاتوں میں بھی اس تحریک نے اپنا اثر چھوڑا، اور تازہ واردان بساط ادب کے حوصلوں کو بھی مہمیز ہوئی، انجمن ترقی اردو ویشالی نے ان کی حوصلہ افزائی کا وافر ساماں فراہم کیا، مختلف موضوعات پر مقابلوں کا انعقاد کرایا، نتیجۃً ایک نئی نسل تیار ہوگئی جو اب کاروان علم وادب کو آگے لے جانے کے لیے تیار کھڑی ہے، اور ہم جیسا بڑھاپے کی منزل کی طرف رواں دواں شخص پیچھے گھوم کر دیکھتا ہے تو اسے خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے بعد بھی اس قافلے کو تیز گام رکھا جا سکے گا، آگے کی طرف دیکھتا ہوں تو تھوڑی مایوسی ہوتی ہے کہ منزل ابھی بہت دور ہے اور ہماری زندگی کی شام ہوا چاہتی ہے، پھر ایک اطمینان کی لہر جسم وجان میں یہ سوچ کر دوڑ جاتی ہے کہ تحریک کے خدوخال طے کرنے اور سنگ ریزوں کا کاٹنے، تراشنے میں جو دقتیں ہمارے وقت کے لوگوں کو اٹھانی پڑیں، بعد میں آنے والے لوگ اس سے محفوظ رہیں گے اور ان کو کام آگے بڑھانے کے لیے نچلی سطح سے کام کو اٹھانا نہیں پڑیگا۔

نئی نسل کے جن لوگوں سے توقعات اور امیدیں وابستہ ہو چلی ہیں، ان میں سراج الہدیٰ

ازہری ندوی، ظفر انصاری ظفر، بشر رحیمی، قمر عالم ندوی، صباء الہدیٰ صبا، صدر عالم ندوی وغیرہ کے نام خاص طور پر لیے جاسکتے ہیں، ظفر انصاری ظفر، بشر رحیمی غزلوں کی دنیا میں نام کمارہے ہیں، قمر عالم ندوی، صباء الہدیٰ ویشالوی صدر عالم ندوی اور عارف حسن وسطوی کی تحریریں بھی اخبارات ورسائل کی زینت بنتی رہی ہیں، محمد سراج الہدیٰ ندوی ازہری نے تحقیقی انداز میں مذہبی موضوعات پر متواتر لکھ کر اہل علم میں اپنی شناخت بنالی ہے، اس طرح دیکھا جائے تو مجموعی طور پر زبان وادب کی تحریک کے لیے ویشالی کی زمین ہموار ہے اور تھوڑی سی توجہ سے بہت سارے کام نمٹائے جاسکتے ہیں۔

بات آگے نکل گئی، میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ انجمن ترقی اردو ویشالی کے ذمہ داروں نے جس بڑے پیمانے پر فعالیت اور سرگرمی کا ثبوت دیا، اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں، ان سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹیں اخبارات میں متواتر اور مسلسل شائع ہوتی رہی ہیں، جن کی وجہ سے دور دراز کے علاقوں تک خدمات کا دائرہ وسیع ہوا، اور لوگوں میں کام کا حوصلہ بڑھا۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ ساری رپورٹنگ انجمن ترقی اردو ضلع ویشالی کے جواں سال اور متحرک جنرل سکریٹری انوار الحسن وسطوی کے قلم سے نکل کر مقبول عام ہوئیں، اللہ رب العزت نے انوار الحسن صاحب کو لکھنے کا اچھا سلیقہ عطا فرمایا ہے، ادب، تنقید، سوانح، شاعری اور مختلف موضوعات پر ان کی تحریریں ادبا اور نقادوں سے سند قبولیت پاچکی ہیں، ان کی تحریریں صاف، شستہ اور غیر ضروری تصنع اور مرعوب کن ادبی صنعتوں کے استعمال سے پاک ہوا کرتی ہیں، جس کی وجہ سے ہر سطح کا آدمی ان کی تحریروں سے فیض یاب ہو پاتا ہے، وہ اردو کے بڑے خادم ہیں اور بڑی خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہتے ہیں، ادب ان کی زندگی کا لازمہ اور اوڑھنا بچھونا ہے، اسی لیے ان کے رہن سہن، وضع قطع، رکھ رکھاؤ، سیمینار وسمپوزیم کے انعقاد میں بھی ادب جیسی سلیقگی پائی جاتی ہے، کم خرچ میں پروگرام کو کس طرح کامیاب کیا جاسکتا ہے اور کس طرح نذرانہ، ہدیہ تحفہ بلکہ آمد ورفت کے اخراجات کی ادائیگی کے بغیر بڑے لوگوں کو پروگرام میں شریک کیا جاسکتا ہے، اس کا فن میرے علم کے مطابق معاصرین میں ان سے زیادہ کسی کے پاس نہیں ہے اور وہ بڑی خوبصورتی سے اسے برتتے رہتے ہیں، پروگرام کے انعقاد کے قبل اور بعد کس طرح پروگرام کے مالہ وماعلیہ کو اخباروں کی زینت بنایا جاسکتا ہے،

کون سا عنوان اخبار والوں کو اپیل کرے گا اور خبر کی ترتیب کس انداز میں کی جائے کہ قاری کی توجہ اس پر مرکوز ہو اس میں انہیں کمال حاصل ہے اور یہی ان کی رپورٹنگ کی نمایاں خصوصیات ہیں، کئی بار ایسا دیکھا کہ تقریر بے جان سی رہی، خود بولنے والے کو بھی اس کا احساس ہوا، لیکن اسی گفتگو سے انہوں نے ایسے جملے منتخب کر لیے جو پروگرام کا نچوڑ قرار پایا اور خود مقرر بھی اس انتخاب کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکا، میں ان کی رپورٹنگ سے چند جملے چھانٹ کر اس تحریر کو مستند کرنے کے بجائے پوری کتاب ہی قاری کی خدمت میں پورے اعتماد کے ساتھ پیش کر رہا ہوں، جنہیں پڑھ کر آپ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ ان کے قلم میں اچھے اور بڑے صحافی کی ساری خوبیاں اور خصوصیات موجود ہیں، اور اس کتاب کی روشنی میں وہ ادیب سے زیادہ صحافی نظر آتے ہیں، مجھے امید ہے کہ انجمن ترقی اردو ویشالی کی ربع صدی پر محیط کارکردگی رپورٹ کی اشاعت سے ویشالی ضلع میں اردو تحریک کی تاریخ محفوظ ہو جائے گی اور آنے والی نسل اس کی روشنی میں کام کرنے بلکہ کام کو آگے بڑھانے کی جدوجہد کرے گی اور یہ زبان جسے مختلف محاذ پر اپنے اور غیروں کے غیر منصفانہ رویہ کا سامنا ہے، اسے انصاف مل سکے گا۔

میں اس اہم کتاب کی تالیف وترتیب پر انوار الحسن وسطوی کو مبارک باد دیتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ ان کا قلم ایسے ہی گہر بار رہے گا اور زبان وادب کی مشاطگی کا کام دیر تک وہ اسی طرح انجام دیتے رہیں گے۔

(۲۸/ رمضان ۱۴۳۱ھ - ۸/ستمبر ۲۰۱۰ء)

چند ادبی شخصیات

یہ دنیا جب سے قائم ہے، آنے جانے والے لوگوں کا تانتا لگا ہوا ہے، نہ کسی کی پیدائش حیرت ناک ہوتی ہے اور نہ کسی کی موت تعجب خیز، قدرت کا ایک نظام ہے، اور اسی نظام کے تحت کچھ ارواح زمین پر قدم رنجہ ہوتی ہیں اور کچھ عالم بالا کی سیر کو چلی جاتی ہیں۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
نہ اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی سے چلے

البتہ لوگوں کی اس بھیڑ میں کچھ لوگ، لوگ نہیں رہتے، شخصیت بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو زندگی کے افق پر بار بار ڈوبتے ابھرتے اور اپنی خوبیوں، خرابیوں کے ساتھ لمحہ لمحہ طلوع ہوتے ہیں، یہ لوگ زندگی کے مختلف مراحل میں ان گنت حادثوں کے درمیان جیتے اور شخصیت کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں، وہ سماج، ملت اور معاشرہ کو بہت کچھ دے کر زندہ جاوید ہو جاتے ہیں، ان حضرات کی زندگی میں دنیا والوں کے لیے سبق ہوتا ہے، ان کا مطالعہ ہمیں حرکت وعمل پر ابھارتا ہے، ہم ان کی کامیابیوں کو اپنے لیے مشعل راہ اور ناکامیوں کو عبرت خیز سمجھ کر اپنے لئے راہ عمل متعین کرتے ہیں، سیر وتاریخ، تذکرہ وقصص کے مطالعہ کا یہ وہ اہم پہلو ہے جسے کسی دور میں نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب چند ادبی شخصیات کے سوانحی خاکے اور تذکرے پر مبنی ہے، یہ جناب نور اسلام صاحب انسپکٹر بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی تحقیقی کدو کاوش کا ثمرہ ہے۔

نور اسلام صاحب کو میں زمانہ طالب علمی سے جانتا ہوں، جب وہ دار العلوم مئو میں پڑھتے تھے اور ہم لوگ پاس پاس رہتے تھے، وہ ایک اچھی اور دلکشی شخصیت کے مالک ہیں، انہیں کوئلے کی کان میں رہ کر آلودگی سے پاک رہنا آتا ہے، تحقیق وتجسس ان کا پیشہ ہے، اور اس پیشے سے انہوں نے اس

کتاب میں خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے، لکھنے کا اسلوب بھی ایک خاص ندرت لیے ہوا ہے، اس لیے قاری پڑھنے میں لذت وکیف پاتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ علمی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور اس کاوش کے نتیجے میں ہم ان شخصیتوں کے بارے میں جان سکیں گے، جنہیں لوگ اب بھولتے جا رہے ہیں۔

انور حسین قاسمی کی شاعری

مولانا انور حسین قاسمی استاد، مدرسہ امدادیہ اشرفیہ راجوپٹی سیتامڑھی کے لیے شاعری ذریعۂ عزت نہیں، وسیلۂ اظہار ہے۔ ان کے تخیلات اسلامیات سے لبریز اور ان کے ادون کے آئینہ دار ہیں، خوش قسمتی سے ان کا تعلق اس علاقہ کی مشہور ومعروف روحانی شخصیت حضرت مولانا عبدالمنان صاحب خلیفہ ومجاز محی السنۃ حضرت مولانا ابرارالحق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں فکری قوت، ایمانی جرأت وحرارت، اسلامی افکار ومعتقدات، محبت رسول سے سرشاری اور آخرت کے لیے عملی جدوجہد کی تحریک پائی جاتی ہے۔ آزادخیالی کے بجائے فکری بندش نے کہیں کہیں ان کے لیے قافیہ، ردیف کو تنگ کیا ہے، البتہ انھوں نے اپنا قافیہ تنگ ہونے سے خود کو بچالیا ہے، یہ ایک اچھی علامت اور مستقبل میں اس راہ میں ترقیات کی ضمانت ہے۔

مولانا انور حسین قاسمی کا دوباب ''نسیم حجاز'' اور ''نسیم سحر'' پر مشتمل مجموعۂ کلام جلوہ گر ہورہا ہے، نسیم حجاز ایک حمد، سولہ نعت اور ایک قطعہ پر مشتمل ہے۔ جس کا آغاز حمد سے ہوتا ہے جسے انھوں نے سورہ فاتحہ کے تناظر میں رقم کر کے شعوری طور پر اپنی فکری تکمیل کا سامان کیا ہے اور اسے ناقص اور دم بریدہ ہونے سے بچالیا ہے۔

حمد کے بعد مسلسل پندرہ نعتیں ہیں، ان نعتوں کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں رائج الوقت مناجات کا رنگ نہیں ہے۔ اس صنف میں ہوتا یہ رہا ہے کہ نبیؐ کی مدح وستائش اور رفعت شان ومرتبت رقم کرتے کرتے شاعر، التجا، دعا، مناجات شروع کر دیتا ہے اور اس فرق کو نظر انداز کر جاتا ہے جو نبوت کو ربوبیت سے الگ کرتی ہے۔ یہ لغزش ''غیروں'' کے یہاں بہت ہے ''اپنوں'' کے یہاں بھی کچھ کم نہیں۔ ہم ان کی تاویل جو بھی کر لیں لیکن تاویل تو از قبیل نکتہ بعد الوقوع ہوا کرتی ہیں، جن میں خواہ مخواہ کمی، کوتاہی اور لغزشوں کو معتقدین، متوسلین تاویلات کے پردے میں چھپانے کی شعوری یا غیر شعوری

کوششیں کیا کرتے ہیں، انور حسین قاسمی کی شاعری میں ایسا کچھ نہیں ہے، جس کے لیے دور از کار تاویلات کی ضرورت پیش آئے، انور کی نظر مذہبیات پر وسیع اور گہری ہے۔ اس لیے وہ اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ نعت، نعت ہے، حمد ومناجات نہیں، ان کے یہاں حُبِ رسول عقیدہ، مسلک اور ایمان کا جز ہے۔ اس لیے وہ اپنے محبوب کے تصور میں کھوجاتے ہیں، اور اس طرح کھوتے ہیں کہ کسی قسم کی اٹھکھیلیاں، چھیڑ چھاڑ، انھیں ناگوار گزرتی ہے۔ کہتے ہیں۔

میں ان کے تصور میں کھویا ہوا ہوں
نہ چھیڑو مجھے میں اُدھر دیکھتا ہوں

اور اس کے ساتھ عقیدہ کا اظہار بھی کر جاتے ہیں۔

نہ پہنچا کوئی تُو جہاں تک پہنچا
مگر پھر بھی تجھ کو بشر دیکھتا ہوں

بشر دیکھنے سے زیادہ صحیح محاورہ بشر جاننا ہے، لیکن قافیہ ردیف کا خیال دامن گیر ہے، اس لیے دیکھتا ہوں بھی چلے گا۔

عشق کے متوالے اور محبت رسول کے دیوانے کو محبوب کی گلی سے بھی پیار ہوتا ہے، وہ شہر، وہ گلیاں، وہ پگڈنڈیاں بھی عزیز ہوتی ہیں، جو در محبوب سے ملی ہوتی ہیں، وہاں بھٹکنا بھی عاشق کو اچھا معلوم ہوتا ہے، وہ جو کچھ کہتا ہے، اس کے لیے الفاظ ڈھونڈنے نہیں ہوتے، بلکہ وہ خود لب پر مچلنے لگتے ہیں۔

مدینہ میں جاکر بھٹکتا رہوں میں
الٰہی! میں ایسی ادا چاہتا ہوں
خود الفاظ لب پہ مچلتے ہیں انور
میں نعت نبی جب لکھا چاہتا ہوں

اور یہ کہ۔

جس جگہ پہ جاکے انور دل منور ہوگیا
کیوں نہ اس دہلیز کے انوار کی باتیں کریں

تمنا ہے آقا کا گھر دیکھ آئیں
نبیؐ کا حرم اک نظر دیکھ آئیں

وہ حجرۃ وہ صفہ وہ محراب ومنبر
وہاں جاکے باچشم تر دیکھ آئیں

شہ دین کا جس نے کلمہ پڑھا تھا
وہ مکہ میں جاکر حجر دیکھ آئیں

وہ صدیقؓ و فاروقؓ و عثمانؓ و حیدرؓ
مدینہ میں ان سب کا گھر دیکھ آئیں

تمنا یہ انورؔ کی پوری ہو یارب
مدینہ کی شام و سحر دیکھ آئیں

مجموعہ کا دوسرا باب ''نسیم سحر'' کے عنوان سے ہے، یہ تین مراثی ایک نذرانۂ عقیدت تین ترانہ، استقبالہ، الوداعیہ نظموں، سہرا رخصتی نامہ اور غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ انورؔ کو مختلف اصناف ادب میں طبع آزمائی کا فن آتا ہے، حالاں کہ ان تمام اصناف کا مزاج لگ الگ ہے اور ہر صنف کے تقاضے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ لیکن انورؔ ان تمام تقاضوں سے بخوبی عہدہ برآ ہوتے ہیں، سہرے کے یہ چند اشعار دیکھئے۔

مہر وخلوص وپیار کا اقرار ہے سہرا
ماں باپ کی دعاؤں کا اظہار ہے سہرا
اک تحفہ خلوص ہے اپنوں کے واسطے
دشمن کے سر پر بے اماں تلوار ہے سہرا

چاند کی نوری جھلک، رقصاں تیرے سہرے میں ہے
جلوۂ نیلم پری عریاں، تیرے سہرے میں ہے

شادی بیاہ میں گیت گانے، ناچ باجے کا جو تصور ہے وہ اسلامی فکر سے میل نہیں کھاتا، اس لیے انور کہتے ہیں:

گیت، گانے، ناچ، باجے کی ضرورت کچھ نہیں
ولولہ، جوش و امنگ و ہر خوشی سہرے میں ہے

نسیم سحر میں تین غزلیں بھی شامل ہیں، یہ غزلیں اپنے فکر وفن کے اعتبار سے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں، انور کا لہجہ غزلوں کی بھیڑ میں اپنی شناخت اور اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہے۔ وہ غزلوں میں محبوب کی بے رخی کا گلہ نہیں کرتے، انھیں شکوہ پورے ماحول اور سماج سے ہے، جہاں ان کا ہم نوا، ہم زباں، اور رازداں کوئی نہیں ہے، وہ جو کہنا چاہتے ہیں، اس کو سننے کے لیے کوئی تیار نہیں، صالح قدروں کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا غم انھیں کھائے جارہا ہے۔ انورؔ کہتے ہیں:

ہم نوا کوئی نہیں ہے، ہم زباں کوئی نہیں
میرا اپنا اس جہاں میں رازداں کوئی نہیں
میں اکیلا جارہا ہوں منزل مقصود تک
ہم سفر کوئی نہیں ہے، کارواں کوئی نہیں
کس کو اب جاکر سناؤں درد کی داستاں
پہلے کچھ احباب تھے اب تو یہاں کوئی نہیں

مختصر یہ کہ مولانا انور حسین قاسمی کا یہ مجموعۂ کلام ہر صنف سے تعلق رکھنے والوں کے لیے اپنے اندر کچھ نہ کچھ رکھے ہوئے ہے، مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا اور اہل علم وادب اس کی پذیرائی کریں گے۔ میری دعا ہے کہ انور صاحب یوں ہی مشاطگی فکر وفن کرتے رہیں تا کہ حق کی آواز دور اور دیر تک سنی جاتی رہے۔

طارق بن ثاقب کی وادیٔ نور

طارق بن ثاقب کی شخصیت اوران کی شاعری، خطاطی اور نقاشی سے مل کر ساحری بن گئی ہے، ان سے ملنے والا ان کے مایا جال میں اس طرح پھنس جاتا ہے کہ نکلنا مشکل ہوتا ہے، ایک بار مل لیجیے اور زندگی بھر کے اسیر ہوجایئے، اسیری بھی ایسی کہ اس پر فخر کیجیے کہ ہم نے طارق کو دیکھا نہیں بلکہ سنا اور برتا بھی ہے۔ کسی نے صاحب عزیمت وبصیرت لوگوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ''ہوتے کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ'' طارق کو دیکھ کر ان کی پراگندگی نہیں، عزیمت وخودداری، بلند حوصلگی کے ساتھ ان کی نستعلیقیت، نظافت، سلیقہ اور رکھ رکھاؤ کا احساس ہوتا ہے، اور کمال فن کے ساتھ اس کی مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

طارق بن ثاقب کی ان خصوصیات کا ہلکا پرتو ان کے حمدیہ، نعتیہ اور دعائیہ کلام وادیٔ نور میں دیکھنے کو ملتا ہے، فکر کی بلندی دماغ کو، آرٹ نقش ونگار اور کتابت کی خوبصورتی دل کو متاثر کرتی ہے، اور آنکھوں کو سرور بخشتی ہے، طارق نے اس مجموعہ کی کتابت میں طغریٰ نویسی کے اعلیٰ نمونے بھی پیش کیے ہیں۔

اللہ کے فضل سے ان کو طغریٰ نویسی میں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے، میں نے متحدہ عرب امارت، انگلینڈ اور افریقہ میں لوگوں کے گھروں، دوکانوں اور ڈرائنگ روم کو اس سے آراستہ دیکھا ہے۔ دیکھیے اور دیکھتے رہ جایئے۔ کاش شروع کے صفحات بھی کمپیوٹر کے بجائے ان کے فن کے مرہون منت ہوتے۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، اس پر بڑے بڑے صاحب نظر، اہل فکر وفن کو ان کا مدح سرا پایا، دیوبند کے دور طالب علمی میں ایک بار حضرت مولانا سعید احمد اکبرآبادی ڈائرکٹر شیخ الہند اکیڈمی دارالعلوم دیوبند کے ساتھ چہل قدمی کررہا تھا، مولانا نے ایک نظر صدر گیٹ پر آویزاں دیواری پرچوں پر ڈالی، پورنیہ کے قلمی پرچہ الاصلاح پر نگاہ پڑی اور ٹک گئی۔ طارق بن ثاقب کی ابتدائی دور کی ایک غزل رومانی رنگ وآہنگ، بلیغ تشبیہات وتلمیحات سے آراستہ اس میں شائع ہوئی تھی، پوری غزل تو یاد نہیں، ایک شعر جس پر مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ پھڑک اٹھے تھے اور پیش گوئی کی تھی کہ یہ لڑکا ایک دن بڑا

شاعر بنے گا۔ ذہن کے نہاں خانے میں آج بھی محفوظ ہے، حالانکہ اشعار مجھے یاد نہیں رہتے اور جو یاد رہتے ہیں ان کو تحت الشعور کی گرفت سے آزاد کرانا اور من وعن نقل کرنا میرے لیے کبھی آسان نہیں رہا؛ لیکن وہ شعر قلم پر آنے کو بے تاب ہے۔

تم جو ناخن تراش کر پھینکو
آسماں پر ہلال ہوجائے

مولانا اکبرآبادی نے کہا، کیا تشبیہ ہے؟ واہ واہ، تراشے ہوئے ناخن کی ہیئت اور ہلال میں کتنی مشابہت ہے اور تشبیہ نے پھینکے جانے والے ناخن کو کیا مقام ومرتبہ عطا کردیا ہے۔ پھر کہنے لگے، تشبیہ کا تعلق بڑی حد تک مشاہدے سے ہوتا ہے، کچی عمر کا مشاہدہ بھی کبھی پختہ ہوتا ہے، ایک بار بہت چھوٹے بچے نے ماں کو چاند دکھاتے ہوئے کہا، وہ دیکھو ٹوٹی ہوئی چوڑی کی طرح۔

آج وہ بچہ بڑا شاعر بن چکا ہے، اور قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید کے مصداق ان کی پیش گوئی صحیح ثابت ہوچکی ہے۔ اور ''کسے آواز دوں؟'' (قطعات) نیز احساس افسردہ (طبع زاد انشائیوں) کے بعد وادیٔ نور لے کر آیا ہے اور علم وادب، شاعری وفن کاری کو بقعہ نور بنارہا ہے۔

وادیٔ نور کا آغاز بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے خوبصورت طغرے اور بصیرت افروز اشعار سے ہوتا ہے، شاعر کو احساس ہے کہ اللہ کی ذات وصفات کی سمائی ذہن وادراک میں نہیں ہوسکتی الفاظ کی تنگنائی میں اس کی حد بندی نہیں کی جاسکتی؛ چنانچہ وہ بڑے خوبصورت انداز میں اپنی عاجزی کا اقرار اور عقیدے کا اظہار کرتا ہے۔

حدود عقل ونظر اور فہم وفکر سے باہر
تمام وسعت کونین سے وہ بالا ہے
زمین کے ذرۂ ناچیز میں منور تو
نجوم وشمس وقمر کہکشاں کے اندر تو
ترے وجود کی تشریح ماورائے شعور
ہر ایک بندش لفظ وبیاں سے باہر تو

تری ثنا سے ہے قاصر شعورِ فہم وخرد
متاع لوح وقلم کا ہے خود ہی مصدر تو

یہ انداز واسلوب صرف مشق وریاض سے حاصل نہیں ہوا ہے، اس کے لیے طارق بن ثاقب نے اللہ رب العزت سے بے پناہ دعائیں کی ہیں، تب جا کر یہ جداگانہ اسلوب حاصل ہوا ہے، کہتے ہیں۔

اسلوب میں اک موج صبا دے اللہ
کہنے کا بھی انداز جدا دے اللہ
روشن مرے افکار سے ہوں سب کے قلوب
مضمون میں تو ایسی ضیا دے اللہ

ممتاز جو کر دے مجھے اوروں سے جہاں میں
اللہ وہ اعجاز ہنر مانگ رہا ہوں

مقبول خاص وعام ہو طارق کی شاعری
کرتا ہے نذر تیری یہ اشعار یا کریم

فکر کی اپنی بلندی کی حدوں کو چھولوں
میرے احساس کے شاہین کو شہپر کردے

مری زباں کو صداقت کے آئینوں سے نواز
مرے قلم کو حقیقت کی روشنائی دے

حمدیہ کلام میں طارق نے بہت اچھے اشعار کہے ہیں؛ لیکن وہ اس سے مطمئن نہیں ہیں۔ خیال ہوتا ہے کہ اللہ کی حمد اس کے شایان شان نہیں ہوسکی تو پھر وہ دعا میں مشغول ہوجاتا ہے۔

کہے گا پھر کبھی طارق حسین حمد تری
کرے گا جو اسے یارب بڑا سخن ور تو

نہ لکھ سکا ابھی طارق حسین حمد تری
بلند فکر اور زور بیان کے مالک

وادئ نور کا ایک بڑا حصہ نعتوں پر مشتمل ہے، عقیدت ومحبت میں ڈوبی ان نعتوں کو پڑھ کر دل کی دنیا میں محبت کی موجیں اچھلنے لگتی ہیں، یہ اچھلتی موجیں دھیرے دھیرے انسان کو عظمت مصطفیٰ کی اس حد تک پہنچا دیتی ہیں؛ جو ہمارے ایمان ویقین کا جز ہے اور جس کے بغیر ہمارا ایمان مکمل نہیں ہوتا ہے؛ لیکن ان حدود تک پہنچانے کے لیے وہ نعت کو دعا اور مناجات نہیں بناتے، ان کا عالمانہ شعور الوہیت ونبوت کے سرے کو ایک دوسرے سے ملنے نہیں دیتا۔ وہ اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہتے ہیں۔

کتنا پیارا یہ قول آقا ہے
ہر مسلماں ہے ماننے والا
میں کہ تقسیم کرنے والا ہوں
اور خدا ہے نواز نے والا

حدیث إنما أنا قاسم والله يعطي کو شعری پیکر میں کس خوبصورت انداز میں ڈھالا ہے۔
اب نعت پاک کے چند اشعار دیکھیے۔

فلک درخشاں زمیں منور، جہاں میں وہ خوش خرام آیا
ہے جس کی خاک قدم فروزاں، وہ بن کے مہر دوام آیا
وہ انقلاب شعور لایا، بساط ہستی میں نور لایا
جہاں تھا محروم روشنی سے، وہ بن کے ماہِ تمام آیا
زبان قاصر قلم ہے عاجز، شعور فہم وخرد ہے لرزاں
خدا نے خود کی ہے جس کی مدحت، وہ بن کے ختم الکلام آیا،

طارق یہاں بھی سپر ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔

خون تشبیہ نچوڑوں بھی تو حاصل کیا ہے؟
تجھ سا کوئی نہ تھا کوئی نہیں آنے والا
کس سے طارق ہو بیاں آقا کے اوصاف وکمال
جب خدا کرتا ہے خود مدح وثنائے مصطفیٰ

اوصاف حقیقی تو وہی لکھ گیا طارقؔ
کہتا ہے زمانہ جسے حسان محمد

وادیٔ نور کی تمام نعتیں طارق نے جس انداز میں لکھی ہیں، خوب لکھی ہیں، اس کے پیش نظر ان کی یہ خواہش حق بجانب لگتی ہے۔

جن نعت نگاروں کی مقبول ہوئیں نعتیں
طارق کا بھی نام آئے ان نعت نگاروں میں

وادیٔ نور کا دعائیہ حصہ بندگی و عاجزی کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ ساری دعائیں قرآن و احادیث سے مستنیر اور فکر اسلامی سے مستفاد ہیں؛ اس لیے ان میں آفاقیت ہے، طارق نے ہمیں نغمۂ عظمتِ قرآن سنایا ہے اور اس سے قلب و نظر کے مجلّٰی کرنے کا درس دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

اخلاص و عمل کا جذبہ بھی ہوتا ہے اسی دل میں پیدا
جس دل میں خدا کی رحمت سے قرآں کی محبت ہوتی ہے
قرآں کی بدولت سر اپنا تھا اونچا بہت اور اب بھی ہے
قرآن منارِ عظمت ہے، عظمت ہی میں عظمت ہوتی ہے
قرآن سے رشتہ محکم پھر، اے کاش اگر ہم اب بھی کریں
تو آج بھی حاصل شانِ عمر، حیدر کی شجاعت ہوتی ہے
امکاں کی حدوں تک قرآں کی، تابندہ شعاعیں پھیلیں گی
وہ دور قریب اب آتا ہے، ضوبار یہ ظلمت ہوتی ہے

اور ان کی دعا ہے کہ

احساس کو موجوں کی روانی دے دے
الفاظ کو انوار معانی دے دے
افکار کو میرے تو بنادے کردار
کردار کو پھر صدق بیانی دے دے

تیشۂ وسنگ کا نظام سہی
شیشہ کاری کو بھی ابھارا دے
کوئی طاقت نہ کر سکے مسمار
میری تعمیر کو وہ گارا دے
گردش ماہ وسال سے مولیٰ
جو نہ جھک پائے وہ منارا دے
اپنے رب سے کہا کرو طارق
شعر کہنے کا طرز پیارا دے

میرا خیال ہے کہ طارق کو مطلوب طرز پیارا مل چکا ہے اور اس کی شاعری نے علم و ادب کی دنیا میں ایسا مقام بنالیا ہے، جو دیر تک باقی رہنے والا سب سے منفرد اور سب سے الگ ہے۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

(مطبوعہ وادیٔ نور)

فضیل احمد ناصری کی حدیث عنبر

مولانا فضیل احمد عنؔبر ناصری القاسمی (ولادت ۱۳؍مئی ۱۹۷۸ء) بن مولانا جمیل احمد ناصری سے میرے تعلقات بہت قدیم نہیں، چند سالوں پر محیط ہیں، ان چند سالوں میں ان کے بارے میں جو کچھ جان سکا، اس کے مطابق وہ اچھے مدرس، بہترین خطیب، اور صاحب قرطاس وقلم نظر آئے، بعض جلسوں میں ایک اسٹیج پر جمع ہونے، محدث عصر کے مطالعہ، اور ان کے بعض شاگردوں کے احساسات سے ہمارے اس خیال کو یقین کا درجہ نصیب ہو گیا۔

ابھی ایک موقع سے جب انہوں نے اپنے مجموعہ کلام پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی، تو میں چونک سا گیا، اچھا تو جناب شاعری بھی کرتے ہیں؟ یہ میرے لیے نیا انکشاف تھا، اور جب ''حدیث عنبر'' میرے پاس پہونچی اور مطالعہ کیا تو حیرت انگیز استعجاب کے کئی مراحل سے گذرنا پڑا اور معلوم ہوا کہ جناب چھپے رستم نکلے، اتنی اچھی شاعری اوزان وبحور کی پابندی، فکر کی بلندئ خیالات کی پاکیزگی اور اثر آفرینی کے ساتھ کم پڑھنے کو ملتی ہے، چنانچہ پڑھا، پڑھتا گیا، اور مبہوت ہوتا رہا۔

''حدیث عنبر'' کے سارے مندرجات مومن کے قلب تپاں کی آواز ہیں، جن میں سوز وگداز ہے، اثر ہے، زندگی کو صحیح رخ دینے کا جذبہ ہے، ماضی پر آہ وبکا کے بجائے مستقبل کو فروزاں کرنے کی شعوری کوشش ہے۔

اس کوشش کو نتیجہ خیز بنانے والی ذات اللہ رب العزت کی ہے، اس لیے مجموعہ کا آغاز حمد سے ہوتا ہے اور اس ذیل میں چھ حمدیہ نظمیں درج ہیں۔ عنؔبر پر بندگی غالب ہے اس لئے اس ذیل میں جو اشعار ہیں، ان میں ''حمد خدائے تعالیٰ'' کے اشعار کے علاوہ بقیہ ساری نظموں کے اشعار حمدیہ کم اور دعائیہ زیادہ ہیں، عنبر مانگتے مانگتے اور حقیقت کا اظہار کرتے کرتے یہاں تک پہونچتے ہیں کہ پکار اٹھتے ہیں۔

میں غنی ہوں ما سوا سے، تری ''ذات حق'' کو پا کے
ترا جلوہ رہ گیا ہے، مری روح میں سما کے

میرے رب! طلب کا کب تک ؛ مری امتحان لے گا
کبھی شاد بھی تو کردے یہ ''حجاب رخ'' اٹھا کے

اور یہ کہ

نہیں کچھ بھی اس کے سوا چاہتا ہوں
فقط آپ کا سامنا چاہتا ہوں
مرا جسم کب سے کڑی دھوپ میں ہے
تری رحمتوں کی ردا چاہتا ہوں
نہایت غم زدہ قلب وجگر ہے آج عنؔبر
تو اپنی دید سے اک بار مجھ کو شادماں کردے

حمد کے بعد ''آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کی شان'' اور ''بارگاہ مصطفوی'' میں دو نعتیں مذکور ہیں، ان میں فکر کی بلندی اور تخیل کی پاکیزگی نمایاں ہے دو چار اشعار دیکھتے چلیں۔

سدا سے جس کے چرچے ہوں زمینوں، آسمانوں میں
انوکھا کیوں نہ ہو اس کا فسانہ سب فسانوں میں
وہ پیکر ؛ آئینۂ قرآن ، تفسیریں کرے جس کی
وہ فطرت ،جس کے دشمن بھی رہے تسبیح خوانوں میں
خدا کے بعد با عظمت اگر ہستی کسی کی ہے
یہی پیغمبر حق ہے جہاں کے حکمرانوں میں

عنؔبر کو آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ارفع واعلیٰ کا ادراک ہے، چنانچہ وہ یہ کہتے ہوئے سپر ڈال دیتے ہیں۔

میں نعت لکھوں انکی ، یہ تاب کہاں عنؔبر
خود خالق عالم ہو جس ذات کا شیدائی

نعت کے بعد منظومات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے، شاعر ''داستان الم بہ جناب باری تعالیٰ'' پیش

کرتا ہے، جو اقبال کے شکوہ کی طرح طویل تو نہیں ہے اور نہ ہی اس ہیئت میں ہے لیکن رنگ پورا شکوہ کا لیے ہوئے ہے۔

ہوا ہے ہر کوئی حامل تشدد کی کہانی کا
نہ جانے کب رکے گا سلسلہ آتش فشانی کا
ترے بندوں نے محرومی سے ایسا دور پایا ہے
وزن یکساں ہوا جس میں خدایا : خون پانی کا
الٰہی ! یہ مصیبت تو مسلمانوں پہ بھاری ہے
مداوا کیا ہے مولا اس بلائے نا گہانی کا

اور پھر جناب باری کی طرف سے اس کا جواب بھی مرحمت ہوتا ہے۔

عمل سے تونے کب اپنی ”مسلمانی“ دکھائی ہے
جہاں پر جان چھڑکتا ہے ہر اک پیروجواں تیرا
فقط شہرت کی خاطر مسجد یں اپنی بناتا ہے
نہ کیوں ہوبے اثر پھر قائد جادوبیاں تیرا
نبی کی زندگی سے ”سیرت فولاذ“ پیدا کر
وگر نہ آگ بر سائے گا پیہم آسماں تیرا

اور اسی شکوہ کے جواب میں عنبؔر کہتے ہیں:

حدیث مرسلاں ہو جا ، خدا کا ترجماں ہوجا
تیری فطرت ہے افلاکی ، سراپا آسماں ہوجا
نبوت کی اہانت کا تحمل موت ہے پیارے
نکل کر حلقۂ صوفی سے شمشیرو سناں ہوجا
اتر آئیں گے اب بھی لشکر نادیدہ نصرت کو
ذرا پہلے تو خود بھی اپنے دیں کا پاسباں ہوجا

منظومات کے دیگر مشمولات ”اس دور کا مسلمان“ ، ”یہ وہ سورج ہی نہیں جس کا مقدر ہو غروب“ ، ”سعودی عرب کے نام“ ، ”ایک غیر مسلم کا سوال“ ، ”مومن صادق کا جواب“ آواز رحیل ، صدائے غیب وغیرہ اس مجموعہ کی بہترین نظمیں ہیں ، دور حاضر کی سیاست ، دنیا ، اس دور کا مسلمان ”آزادی کے بعد“ عصری حیثیت سے بھرپور نظمیں ہے ، جس میں رمز وکنایہ میں بڑی باتیں کہی گئی ہیں۔ تلمیحات کے سہارے تاریخ کے اوراق الٹے گیے ہیں، زمانے کے نشیب وفراز سے آگاہ کیا گیا ہے اور عواقب ونتائج کی طرف اشارے کیے ہیں، ”صحابہ کرام“ کے عنوان سے شامل نظم میں عقیدت ومحبت کا بھرپور اظہار ہے اور واضح کیا گیا ہے۔

نہیں ہوتی یہ جماعت تو ہمیں دین کیسے مل جاتا؟
انہیں کے فیض سے ہم لوگ راہ حق پر چلتے ہیں

ایک نظم ”دور حاضر کے شیوخ“ کے عنوان سے ہے اس نظم کا لہجہ جارحانہ ہو گیا ہے، اور بات حقیقت سے دور جا پڑی ہے۔

صورت میں ولی اور طبیعت میں ہیں انگریز
اس دور کے ملا نہیں چنگیز ہیں چنگیز
حق بات بتانے میں نہیں مجھ کو کوئی عار
جتنے بھی ہیں ”شیخان حرم“ سب ہیں شر انگیز
ہے بغض وعداوت سے عبارت تری ہستی
مانا ترا ”انداز خطیبانہ“ ہے ”گل ریز“

”جتنے بھی ہیں“ کی عمومیت نے اسے حق سے دور کر دیا ہے، اور اعتدال کا دامن ہاتھوں سے جاتا رہا ہے۔ یہ معاملہ استثنائی ہے اسے استقرائی قرار دینا کسی طور صحیح نہیں ہے۔

حدیث عنبؔر میں غزلیات کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے، عنبؔر کی شخصیت کا بنیادی عنصر مذہب ہے، اس لیے ان کے افکار میں مذہبی اقدار غالب ہیں انہیں مٹتی قدریں، بے حجاب زندگی، عریاں اور ننگے جسم دیکھ کر کڑھن ہوتی ہے، معاشرہ کدھر جا رہا ہے؟ اور دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی؟ سوچ کر وہ محو حیرت ہیں۔

عریانیت کی ایک کرامت یہ دیکھیے
ہر برہنہ کا نام ہے عزت مآب میں

بے پردہ جو ہیں ان کی کہانی ہی چھوڑیے
وہ بھی ہیں بے نقاب کہ جو ہیں نقاب میں

عریانیت کا بھاؤ ہے اتنا بڑھا ہوا
کپڑے کی کمپنی ہے سدا پیچ وتاب میں

مسلم بھی یاں گناہ میں اوروں سے کم کہاں؟
پایا نہ میں نے فاصلہ آب وسراب میں

جدید غزل نے زندگی کے مسائل سے اپنے کو جس قدر ہم آہنگ کیا ہے، زلف وگیسو، کاکل وشانے کا ذکر اسی قدر پیچھے چلا گیا ہے، عنبر کی غزلوں میں بھی مسائل زندگی غالب ہیں۔

نہ کرنا اس صدی میں مجھ سے اے دوست
شمع کی اور پروانے کی باتیں

صالح قدروں کو ادب میں رواج دینے کا جو طرز جدید شاعروں نے اپنایا ہے، عنبر کی شاعری کو ہم اس طرز کی نمائندہ شاعری کہہ سکتے ہیں۔

لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ عنبر عشق ومحبت کے کوچے سے نابلد ہیں اور انہیں اس راہ سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، اس باب میں بھی اس مجموعے میں اچھے خاصے اشعار ہیں، جنہیں پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ عشق کی گرمی نے شاعر پر بھرپور اثر کیا ہے اور ''مکتب الفت'' کے ''تلمیذ جفا کش'' کو محبوب کی ادائیں ہی یاد رہ گئی ہیں۔

دشمن کی دغا یاد نہ ناصح کا کہا یاد
اب کچھ نہیں مجھ کو تری یادوں کے سوا یاد

میں ''مکتب الفت'' کا ہوں'' تلمیذ جفا کش''
کرتا ہوں بڑے لطف سے بس تیری ادا یاد

مولانا فضیل احمد ناصری حدیث کے استاذ ہیں اس لیے یہ رنگ ان پر غالب ہے، مجموعہ کا نام حدیث عنبر محدثانہ زیادہ ادیبانہ کم ہے اس کو پڑھ کر عنبر والی روایت کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ ادب وشاعری کی طرف نہیں۔

حدیث عنبر کے اسلوب آہنگ اور لفظیات کو دیکھیں تو یہ قوس قزح کی طرح ہیں، ان میں کہیں علامہ اقبال کا اسلوب، کہیں کلیم عاجز کا آہنگ اور کہیں میر کی لفظیات کا احساس ہوتا ہے، اور یہ سب عنبر کے اپنے رنگ وآہنگ سے مل کر نیا سر اور نئی آواز بن جاتے ہیں، نیا کیف اور نیا سرور پیدا کرتے ہیں اور قاری اس کیف وسرور میں ڈوب کر آخری صفحے تک مطالعہ کا عمل جاری رکھتا ہے، یہ مولانا فضیل ناصری کی شاعری کا کمال ہے، اور اسی کمال کے سہارے یہ مجموعہ شائقین شعر وادب سے خراج تحسین وصول کرلے گا۔ ایسی ہمیں امید ہے۔

(۱۶؍رجب ۱۴۳۴ھ-۲۷؍مئی ۲۰۱۳ء)

جل ترنگ

پروفیسر محمود نہسوی کا نام و کام محتاج تعارف نہیں ہے، وہ اچھے استاد، حساس قلم کار، مشہور کالم نگار اور معروف سماجی خدمت گار ہیں، بہار اردو اکیڈمی کے وائس چیرمین کی حیثیت سے اردو زبان وادب کی خدمت میں بھی ان کا اہم رول رہا ہے، ان کے حساس ذہن کی پیداوار، احساس کا کرب (افسانوی مجموعہ) سماج کی بے رحم تلوار (ناولٹ) نفرت کی آگ اور برے پھنسے (ڈرامے) قارئین سے داد تحسین وصول کر چکے ہیں، پروفیسر محمود نہسوی کی عمر جس طرح بڑھتی جارہی ہے، اس تیزی سے ان کا قلم سیال اور رواں ہوتا جارہا ہے، لکھنا انہوں نے دور طالب علمی سے شروع کیا اور آج بھی ان کے تخلیقی سوتے خشک نہیں ہوئے ہیں۔

''جلترنگ'' ان کا مشہور کالم ہے، جو برسوں سے روزنامہ قومی تنظیم میں چھپتا رہا ہے، اس عنوان کے تحت وہ سماج میں پھیلی بے راہ روی، اخلاقی قدروں کا زوال، مالک حقیقی پر اعتماد، تاریخی حقائق اور اس سے مستنبط عبرت ناک نتائج اور وقتی مسائل پر اظہار خیال کرتے رہے ہیں، قارئین کو اس کالم کا ہمیشہ انتظار رہتا ہے اور جو لوگ اخبارات کی سرخیاں پڑھ کر چھوڑ دیتے ہیں وہ بھی اس کالم کا حرف حرف پڑھا کرتے ہیں۔

میرے نزدیک ''جل ترنگ'' کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی اثر آفرینی ہے، اس کو پڑھ کر انسان اثر پذیر ہوتا ہے اور کہیں نہ کہیں اسے لگتا ہے کہ معاملہ جہاں تک پہنچ گیا ہے وہ افسوس ناک، المناک اور کرب ناک ہے، اس لیے ہمیں کچھ کر گزرنا چاہیے، اس طرح دیکھیں تو ''جل ترنگ'' دلوں میں ترنگ، ارتعاش اور لہر پیدا کرتا ہے، یہ ترنگ خوشی کے نہیں غم والم کے، درد وکڑھن کے ہوتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سماج میں بھیانک آگ لگی ہوئی ہے اور ایک آدمی کھڑا ہو کر، آگ، آگ، بچاؤ، بچاؤ، بجھاؤ، بجھاؤ کی آواز لگا رہا ہے، ایسے موقع پر بولنے والے کا لب ولہجہ نہیں دیکھا جاتا ہے، سب کی

نگاہ اس آگ کی طرف ہوتی ہے، جو سب کچھ خاکستر کرتی جارہی ہے۔

پروفیسر محمود نہسوی کا کمال یہ ہے کہ وہ اس ہنگامی حالت اور شکست وریخت کے موقع سے بھی الفاظ کے دروبست، لہجے کے اتار چڑھاؤ، ادبی رکھ رکھاؤ اور صنعتوں کے التزام پر توجہ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے ''جل ترنگ'' سماج کی چیخ نہیں معلوم ہوتی، جس کی آواز بے ہنگم اور بھدی ہوتی ہے، وہ ایک ایسے آدمی کی آہ معلوم ہوتی ہے، جس میں سماج کا سارا درد وکرب سمایا ہوا ہے، اس آہ میں ایک سلیقہ ہے، ایک ترنگ ہے۔

اس سلیقہ ہی کا نتیجہ ہے کہ ''جل ترنگ'' کے تمام مضامین کا اسلوب یکساں نہیں ہے؛ بلکہ ان میں خاصہ تنوع پایا جاتا ہے، پروفیسر محمود نہسوی عنوان کے اعتبار سے اسلوب اختیار کرتے ہیں، کسی مضمون میں سنجیدگی غالب ہے تو کسی میں ظرافت اور انشاء کا رنگ جھلکتا ہے، کہیں طنز کے تیروں سے سابقہ پڑتا ہے اور کہیں محبت والفت کی بھینی بھینی خوشبو مضامین کو عطر بیز بنائے ہوئے ہے، لب ولہجہ اور اسلوب کا یہ تنوع تخلیق کار کی مجبوری ہے، ظاہر ہے وہ موت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے، عمل سے زندگی بنتی ہے کا درس دیتے ہوئے، مسلم نوجوان کو تدبر پر ابھارتے ہوئے، سراپا نور ہونے کے لیے دل جلانے کی تلقین کرتے ہوئے، زمین قرطبہ کو دیدۂ مسلم کا نور ثابت کرتے ہوئے، غیر سنجیدہ نہیں ہوسکتا اسی طرح جب پروفیسر صاحب خون صد ہزار انجم سے سحر پیدا ہونے کی بات کرتے ہیں، فسانہ کو نیا موڑ دینے کی سوچتے ہیں، سلیقہ کے ساتھ غم دوراں میں جینے کا عزم پیدا کرنا چاہتے ہیں، سکون وثبات کو فریب نظر قرار دیتے ہیں، رتھ یاتراؤں کا منظر اور پس منظر پیش کرتے ہیں، نیکی کر دریا میں ڈال کی کہانیاں سناتے ہیں، مسلم حکمراں کو قومی یک جہتی کا علم بردار کہتے ہیں، ایمان محکم سے دنیا میں ثبات زندگی کی راگ الاپتے ہیں، ایک چہرے پہ کئی چہرے سجانے کا ذکر کرتے ہیں، تو فطری طور پر ان کے اسلوب پر داعیانہ رنگ وآہنگ غالب آجاتا ہے، وہ جب حرم کی پاسبانی کے لیے مسلمانوں کے اتحاد کی صدا لگاتے ہیں، اللہ اللہ کی قدر کا گن گان کرتے ہیں، عشق کے آداب، خود آگاہی سکھانے کا ذکر کرتے ہیں، اخوت کا بیان اور محبت کی زبان ہو جانے کی تلقین کرتے ہیں، تو ان کا لہجہ دوسرے مضامین سے الگ ہو جاتا ہے، جب وہ کوئی عنوان تاریخ کے حوالے سے اٹھاتے ہیں تو ان میں تاریخی رنگ جھلکتا

نہیں، چھلکتا ہے، اسی طرح نہسوی صاحب جب قربانی کے بکرا کی روداد سناتے ہیں، نیتا جی کی سر گزشت پر قلم اٹھاتے ہیں، الیکشن کی تصویر کشی کرتے ہیں تو ان میں طنز و مزاح کی لہریں واضح طور پر محسوس ہوتی ہیں۔

مختصر یہ کہ ''جل ترنگ'' نامی یہ کتاب قوس قزح کی طرح ہے، جس میں ہر قاری کو اپنے ذوق کی چیز اور ہر ادب شناس کو کچھ نہ کچھ مل جائے گا، اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس مجموعہ کی افادیت کو عام کرے اور پروفیسر صاحب کو تسلسل کے ساتھ ان موضوعات پر قلم اٹھاتے رہنے کا حوصلہ بخشے، نہ غم دوراں اس راہ میں حائل ہو اور نہ غم جاناں۔

(۲۵/ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ - یکم مارچ ۲۰۱۱ء)

آ گہی

جناب صفی اختر کے مضامین کا مجموعہ ''آ گہی'' ہمارے سامنے ہے، یہ مضامین ملی اتحاد اور دوسرے اخبارات و رسائل، جرائد و ماہنامے کے توسط سے قاری کی نظر سے گزر کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں، اور ان کی اہمیت وافادیت کو ہم جیسے چھوٹوں نے نہیں، بڑے بڑوں نے تسلیم کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ملی اتحاد کے کسی شمارہ میں ان کا مضمون نہ ہو تو قاری کو ایک قسم کی تشنگی کا احساس ہوتا ہے، مضامین کی یہ اہمیت و معنویت دراصل ان کے مطالعہ اور مشاہدہ کی وسعت کی وجہ سے ہے، مطالعہ اور مشاہدہ کی اس وسعت کی وجہ سے ان کے موضوعات میں تنوع اور مندرجات میں صداقت پائی جاتی ہے، پھر ان کا اسلوب ایسا شگفتہ، پاکیزہ اور رواں ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اس میں ڈوبتا چلا جاتا ہے، کسی بھی فن کار اور قلم کار کے لیے یہ سرمایہ افتخار ہے۔

''آ گہی'' میں صفی اختر صاحب کے جو مضامین شامل ہیں، ان میں مذہبیات، سیاسیات، وفیات، تبصرہ جات، ملکی و غیر ملکی واقعات کے مضمرات سبھی پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے، لکھا ہے اور خوب لکھا ہے، صفی اختر صاحب کے یہ مضامین ان کی دردمندی اور اسلام کی تئیں فکرمندی کی واضح اور روشن دلیل ہیں، اسلام سے وابستگی نے ان کو قول و عمل کے تضاد سے دور رکھا ہے، وہ جو سوچتے ہیں لکھتے ہیں اور جو لکھتے ہیں ان پر خود بھی عمل پیرا ہونے اور دوسروں سے عمل کرانے کا جذبہ ہی نہیں حوصلہ بھی رکھتے ہیں، سوچتے سب ہیں، لیکن صفی اختر صاحب کی طرح حوصلہ کے ساتھ میدان عمل میں کودنے والوں کی تعداد بہت ہی کم ہے، انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''دنیا میں ہم جس تبدیلی کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ خود اپنے اندر لانا ہوگا، اچھا محسوس کرنے کے لیے اور آس پاس کی چیزوں کو بدلنے کے لیے سب سے پہلے خود کو بدلنا ضروری ہے''۔

صفی اختر صاحب کے کردار کی جو خوبی ہے وہ لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کرتی ہے، ان کے

کردار کی اس پاکیزگی اور شخصیت کی تشکیل میں ان کے خاندانی ماحول، علماء، صلحا سے ان کی طویل رفاقت کے ساتھ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا بڑا ہاتھ رہا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ہمارے عہد کے مرحومین میں امیر شریعت رابع حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نور اللہ مرقدہ کے بعد قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور مولانا وحید الزماں کیرانویؒ رجال سازی کے حوالے سے دو بڑے معتبر نام ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان حضرات نے جسے چھودیا، کام کا ہو گیا، لاجونتی کی طرح چھوئی موئی تھا تو بھی کارزار زندگی اور رزم گاہ حیات میں اپنی صلاحیت اور صالحیت کا لوگوں سے لوہا منوالیا۔

صفی اختر صاحب کی تحریروں میں حوصلہ مندی اور رجائیت کا درس ہمیں کچھ کر گزرنے پر آمادہ کرتا ہے، ان کا خیال ہے کہ

''آج بدعنوانیوں کے باوجود اپنی صلاحیت کا سکہ جمانے والے ہی اپنا حق چھین سکتے ہیں، اپنی تمام محرومیوں کے باوجود امیدوں کا دامن چھوڑ نا قطعی عقل مندی نہیں، خواب دیکھنا اور بھروسہ کرنا ٹھیک ہے، مگر جو دوسروں سے بہتر مظاہرہ کرتا ہے وہی فاتح ہوتا ہے۔''

صفی اختر صاحب کی ان تحریروں کو پڑھتے وقت ہمیں ان کی ذہنی آسودگی اور ٹینشن فری (Tention Free) رہنے کا احساس ہوتا ہے، دماغی طور پر پریشان کوئی شخص اتنی برجستگی سے نہیں لکھ سکتا، سو اس راز کے پیچھے ان کی شریک حیات کا بہت دخل ہے، وہ ویشالی ضلع کی ہیں، جہاں کی خاک میں اللہ رب العزت نے احساس ذمہ داری اور وفا شعاری رکھی ہے، وہ گھر کے سارے ماحول اور ساری الجھنوں کو پوری احساس ذمہ داری کے ساتھ حل کرتی رہتی ہیں، اور صفی اختر صاحب کا سارا وقت اور پوری توجہ ادارتی امور کی انجام دہی اور مضامین پر مضامین لکھنے میں صرف ہوتا ہے، اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو اس چشم کشا مجموعہ اور دل آویز تحریر کے لیے دونوں شکریہ کے مستحق ہیں، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

(۲/ ربیع الاول ۱۴۳۱ھ - ۱۷/ فروری ۲۰۱۰ء)

لاعلاج نہیں

اللہ رب العزت نے اس کائنات کی تخلیق کی اور اس کے ماحول کو مختلف قسم کی اشیاء سے اس طرح سجایا سنوارا کہ انسان اس میں راحت اور آرام کے ساتھ زندگی گزار سکے، تخلیق میں قدرتی توازن جب تک برقرار تھا، انسانی جسم میں امراض کا گزر کم ہوتا تھا، پھر ہم نے اپنی ایجادات سے قدرتی ماحول کو بدلنا شروع کیا، پیڑ کٹنے لگے، پہاڑ توڑے جانے لگے، سمندر کو پاٹنا شروع کیا اور غلاظت کی نالیاں ندی کے پاک وصاف پانی میں گرانے لگے، کارخانوں نے دھوئیں کے غولے فضا میں اڑائے اور اس طرح دیکھتے دیکھتے سارا نقشہ بدلتا چلا گیا، اس تبدیلی سے فضائی آلودگی پیدا ہوئی اور قدرت کا بخشا ہوا پاکیزہ ماحول ختم ہوتا چلا گیا۔

دوسری طرف ہم جوع البطن کے شکار ہوئے، اس کے لیے ہم نے ''نمو'' کے قدرتی وسائل کے بجائے کیمیاوی چیزوں کا سہارا لیا، غذا کی قلت کا حل ہم نے کھاد کے ذریعہ پیداوار کی افزونی کو قرار دیا، پیٹ بھرنے لگے؛ لیکن کیمیکل کے ذریعہ تیار غذا نے ہمارے اندر کے جسم کو متاثر کیا۔ اوسط عمر کے تناسب میں کمی آئی اور مرض نے ہمارے جسم کو اپنی آماجگاہ بنالیا۔ اب ہر آدمی مرض کی وجہ سے پریشان ہے۔ صحت مند جسم کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے اور ہر کوئی اپنی گم گشتہ پونجی صحت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔

اس کے حل کے لیے مختلف قسم کے طریقۂ علاج سامنے آئے ہماری عجلت پسندی نے سہل الحصول اور کم وقت میں اپنا اثر دکھانے والے طریقۂ علاج کو پسند کیا اور اپنا جسم ہم نے اس کے حوالے کر دیا۔ اس کا فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ہم کچھ مرض سے نجات پاگئے؛ لیکن ساتھ میں کچھ نئے مرض نے بھی سر ابھارنا شروع کیا۔ کچھ کو لاعلاج قرار دے کر اپنی کم علمی کا اعتراف میڈیکل سائنس نے کرلیا۔ مغز ماری جاری ہے، تحقیق وتفتیش ہورہی ہے اور امید ہے کہ یہ لاعلاج امراض بھی دوا کی قید میں جلد آجائیں گے۔

اس وقت ایلوپیتھ، ہومیوپیتھ، آیوروید، طب یونانی اور نیچروپیتھی کا ذکر خاص طور پر طریقہ علاج

میں کیا جاتا ہے اور ہر آدمی اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق مختلف طریقہ علاج کے لیے اطبا و معالجین کے سامنے اپنے کو پیش کرتا ہے۔ ہمارے مخلص و کرم فرما حکیم مظفر حسین اجمل، نیچرو پیتھی پر یقین رکھتے ہیں اور بہترین نیچرو پیتھک حکیم ہیں اور ان کے طبی مضامین و مقالات اخبارات و رسائل میں چھپتے رہے ہیں، جن سے قارئین نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اب ان مضامین و مقالات کو ''لا علاج نہیں'' کے نام سے کتابی شکل میں سامنے لایا جا رہا ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ میں نے ان میں سے کئی کو حرفاً حرفاً پڑھا ہے؛ لیکن بیشتر پر سرسری نظر ڈالی ہے، میرے خیال میں حکیم صاحب نے جو تحقیقات پیش کی ہیں، ان میں سے کئی تو انکشافات کے درجہ کی ہیں اور ان پر بحث و تحقیق کی عمارت نئے سرے سے کھڑی کی جاسکتی ہے، علم و تحقیق کی دنیا سے الگ ہٹ کر اگر اس میں درج علاج کے طریقوں کو اپنایا جائے اور غذا اور پھلوں کے ذریعہ علاج کا جو مشورہ طب نبوی ﷺ کی روشنی میں دیا گیا ہے، اس کو برتا جائے تو بہت ساری بیماریوں سے ہم نجات پاسکتے ہیں۔

میں حکیم صاحب کو اس اہم کتاب کی تالیف پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کا فائدہ عام و تام فرمائے۔

حاضری

جناب عبدالخالق خلیق کے نام و کام سے میری واقفیت ''تذکرہ آل تراب و سرگزشت عبدالخالق خلیق کے عکسی نسخہ کے ذریعہ ہوئی تھی، میں ان دنوں تذکرہ مسلم مشاہیر ویشالی'' کی تصنیف میں مشغول تھا اور اتفاق سے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں یہ نسخہ موجود تھا، بیسویں صدی کے نصف اول کی روداد، حاجی پور کے اہم واقعات و حادثات، بلکہ غذائی اجناس کی قیمتیں، سیاسی اتھل پتھل، علمی وادبی پیش رفت، ادارے، اور کتب خانوں کے احوال و آثار، روزنامچہ کی شکل میں تفصیلی طور پر اس کتاب میں مرقوم و مذکور نظر آئے، میں نے اپنی تصنیف میں اس سے بہت استفادہ کیا، اسی وقت سے جناب عبدالخالق خلیق کی محبت اور انسیت دل میں قائم ہوئی اور ان کی حیات و خدمات سے واقفیت ہوئی۔

اسی کتاب میں یہ دیکھنے کو ملا تھا کہ انہوں نے اپنے سفر حج بیت اللہ و زیارت اور اس موقع کی قلبی واردات و کیفیات کو الگ سے ''حاضری'' کے نام سے روزنامچہ کی شکل میں لکھا ہے، بعض اقتباسات بھی اس میں درج تھے، بعد کے دنوں میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی مجلسوں اور ملی تنظیموں کے مختلف پروگراموں میں ان کے صاحبزادے محترم جناب ڈاکٹر شاکر خلیق صاحب سے راہ و رسم بڑھی اور دوران گفتگو یہ بات آتی رہی کہ اس سفر نامہ کو چھپنا چاہیے، یہ پورا خانوادہ علمی و معاشی اعتبار سے جس قدر مضبوط ہے، اس کے پیش نظر یہ کام چنداں مشکل نہیں تھا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے ایک وقت ''تذکرہ آل تراب'' کے چھپنے کا مقرر کیا تھا، اور ایک وقت اس سفر نامہ کی طباعت کا۔

اللہ کا شکر ہے کہ وہ وقت آپہنچا اور ڈاکٹر شاکر خلیق صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ اب یہ سفر نامہ پریس جانے کو ہے ان کی والدہ کے انتقال پر تعزیت کے لیے حاضر ہوا تو انہوں نے مسودہ بھی دکھایا، بعد کی ملاقات میں حکم ہوا کہ اس پر میں کچھ لکھوں۔

چنانچہ میں نے اس سفر نامہ کو پوری دلچسپی سے پڑھا، اس کا مسودہ عام کاپی سائز کے تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ہے، یہ سفر نامہ اصلاً ۴/ دسمبر ۱۹۷۰ء سے شروع ہوتا ہے اور یکم مئی ۱۹۷۱ء کو ختم سفر پر ختم

ہوتا ہے، ہیئت کے اعتبار سے یہ روزنامچہ اور انداز بیان کے اعتبار سے سفرنامہ ہے۔

سفرنامے دوران سفر ہمارے قلبی احساسات وکیفیات نیز واردات کے ترجمان ہوتے ہیں، اس کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسافر پر دوران سفر کیا گزری، اور مشاہدات نے اس کے دل ودماغ کو کہاں کہاں اور کس کس طرح متاثر کیا ہے، پھر چونکہ عمرہ، حج وزیارت، سفر عشق وعبادت ہوتا ہے، اس لیے اس میں یہ رنگ اور گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔

عربی میں اس قسم کے سفرنامہ لکھنے کی روایت قدیم رہی ہے، اس سلسلہ میں محمد بن احمد بن جبیر الکتانی الاندلسی (۶۰۷-۵۰۸) محمد بن عمر بن رشید الفیر ی الاندلسی (۷۱۱-۶۵۷) محمد بن علی العبدری، قاسم بن یوسف بن علی التجیبی (۷۳۰-۶۷۰) محمد بن عبد اللہ بن محمد اللواتی الطنجی المعروف بابن بطوطہ (۷۹۹-۷۰۳) خالد بن عیسی بن احمد البلوی الاندلسی، خلیل بن ایبک الصفدری (م۷۶۴ھ) ابو الحسن علی القلصاوی الاندلسی (م۸۹۱ھ) شیخ عبد القادر الجزیری الحنبلی (م۹۴۴) محمد بن شیخ زین العابدین (۱۰۲۸ھ) ابوسالم عبداللہ بن محمد العیاشی (۱۰۹۰-۱۰۴۰) کے سفرنامے قدیم سفرناموں میں خاص مقام رکھتے یں، اس کے علاوہ عربی ہی میں علامہ شکیب ارسلان کا سفرنامہ، المشاعر اللطاف إلى خير مطاف کا اپنا ایک مقام ہے۔

اردو میں یہ کام نسبتا اور فطرتا دیر سے شروع ہوا، جو لکھے گئے وہ بھی وسائل کی کمی کی وجہ سے مخطوطہ کی شکل میں رہے، پھر پریس کا دور آیا، طبع ونشر کی سہولیات حاصل ہوئیں، سفرنامے طبع ہوکر ہمارے سامنے آنے لگے، اس سلسلہ میں کلیم عاجز کا سفرنامہ ''یہاں سے کعبہ، کعبہ سے مدینہ، مولانا عبد الماجد دریابادی کا ''سفر حجاز، غلام رسول مہر کا ''سفرنامہ حجاز'' ممتاز مفتی کا سفرنامہ ''لبیک''، سید بہار الدین کا سفرنامہ ''گلستان حجاز'' اور مولانا محمد ناظم ندوی کا سفرنامہ ''ہندوستان سے دیار حرم تک'' نے قبول عام وتام حاصل کیا۔

اور اب ہمارے سامنے جناب عبد الخالق خلیق کا سفرنامہ ''حاضری'' کے نام سے موجود ہے ''حاضری'' کا لفظ ہمیں بتاتا ہے کہ ایک بندہ خدا دربار خداوندی اور آستانہ نبوی پر کس انداز میں حاضر ہورہا ہے، یہ لفظ اس عاجزی، انکساری، فرومائیگی کا مظہر ہے، جو خالق کو مخلوق سے اور جو ایک عازم

حج کو خصوصی طور پر مطلوب ہے، سفرنامہ میں جابجا اس کیفیت کا غیر شعوری طور پر احساس ہوتا ہے، سفر کا پورا دورانیہ پانچ ماہ بنتا ہے، پانچ ماہ کے کم وبیش ایک سو پچاس دن میں انہوں نے جو کچھ دیکھا ہے، سب پر تو نہیں، کچھ پر روشنی ڈالی ہے، خود ہی لکھتے ہیں: ''یہاں پہنچ کر جو باتیں ظاہری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، اور جن کا احساس ہورہا ہے، ان پر کچھ روشنی ڈال دینی مقصود ہے'' لیکن اللہ کے گھر کی تجلیات لامحدود ہیں، رسول اکرم ﷺ کی جمالیات کو بھی الفاظ میں نہیں بیان کیا جاسکتا، یہاں آکر ساری فکر اور قلم کی ساری روانی دھری دھری کی رہ جاتی ہے، جناب خلیق کا بھی کچھ یہی حال ہے، لکھتے ہیں: ''یہ چند جملے جو قلم بند ہورہے ہیں وہ اس حقیقت کے مقابلے کچھ نہیں''

سفرنامہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ واقعات کی روشنی میں جہاں جہاں موقع ملا ہے، معاشرہ کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے ایک اقتباس دیکھئے: ''جماعت کی نمازیں، نہ حنفی کی پوچھ ہے، نہ مالکی اور نہ شافعی کی، ایک اذان، ایک امام، ایک تکبیر پر والہانہ باادب جھکنے کے حکم پر جھکنا اور سجدہ کے حکم پر زمین بوس ہونا، اقبال نے یہیں کے لیے کہا تھا۔

محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد
بہ طوف شمع پروانہ با پروانہ ہمی سازد

اس طرح دیکھیں تو ''حاضری'' واقعات کی کھتونی نہیں ہے، قلبی واردات وکیفیات کا برملا اظہار ہے، اس اظہار کے لیے زبان سلیس، شستہ، شگفتہ، رواں اور ادبی استعمال کی گئی ہے، بروقت اور برمحل مختلف شعراء کے اشعار کے استعمال نے ادبی لب ولہجہ کو مزید پختگی عطا کی ہے، ماجرا نگاری اور منظر کشی بھی بہت خوب ہے، تاریخی احوال کے ذکر سے اسے بوجھل بنانے سے قصدا گریز کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ ''حاضری'' ایک ایسا سفرنامہ ہے جس کو پڑھ کر ہم حج بیت اللہ کے موقع سے مصنف کی دلچسپیوں، امنگوں، حسرتوں، نارسائیوں سے کلی طور پر واقف ہوتے ہیں، حیرت واستعجاب کے ساتھ مصنف کے ذہن ودماغ کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر رفاقت اور قربت محسوس کرتے ہیں، ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ہم مصنف کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں، یہ ہمارا احساس ہے، آپ کو کیسا لگتا ہے؟ یہ آپ جانیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ سفرنامہ دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔

دینی مدارس اور دہشت گردی

مدارس اسلامیہ دینیہ پوری دنیا میں عموما اور ہندوستان میں خصوصا ہماری علمی، مذہبی اور تہذیبی شناخت کا بڑا ذریعہ ہیں، ہم ان کے بغیر نہ تو اسلامیات کی تعلیم کا تصور کر سکتے ہیں اور نہ ہی فرائض دین کی تفہیم اور تعبیر وتشریح کا، ان اداروں نے اعلیٰ اخلاق کردار واقدار کی عملی تجسیم اور اچھے انسان کو وجود بخشنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے، اور دین پر چلنے کی راہ ہموار کی ہے۔ یہاں کے فارغین نے اس مادی دور میں بھی دنیاوی عیش وآرام سے الگ ایک دنیا بنائی ہے، جو خدا پرستی اور وحدانیت کے اونچے اور عظیم نصب العین پر قائم ہے، اور جس میں مادی طلب کا کوئی عنصر اور جاہ ومنصب کی لالچ نہیں پائی جاتی اور جہاں آج بھی اجرت کے جذبہ سے نہیں، اجر کے جذبے سے لوگ خدمت کرتے ہیں۔ یہاں کے فیض یافتہ افراد جس شعبہ میں بھی گئے، وہاں انہوں نے اپنی ایک تاریخ بنائی، جادہ جادہ اپنے نقوش چھوڑے اور حصول مال کی جدوجہد کی اس دنیا میں بے نیازی، خودداری اور حرص وطمع سے دور رہ کر کام کیا۔

بدقسمتی سے گزشتہ کچھ سالوں سے ایک خاص سازش کے تحت ان مدارس کو مطعون کرنے، انہیں دہشت گردی کے مراکز قرار دے کر یہاں کے فضلا اور فارغین کو سماجی بوجھ سمجھنے کی فضا بنائی جا رہی ہے اور مختلف ذرائع ابلاغ سے منظم انداز میں اس کی اشاعت کا عمل جاری ہے، کئی مدارس پر چھاپے بھی مارے گئے، انہیں خوف زدہ کیا گیا، تلاشی لی گئی، مگر کسی بھی مدرسہ سے کوئی قابل اعتراض چیز آج تک نہیں ملی، اس کے باوجود ان الزامات کو ٹیپ کے بند کی طرح بار بار دہرایا جا رہا ہے اور انگریزوں کے اس قول پر عمل کیا جا رہا ہے کہ جھوٹ کو اتنی بار بولو کہ وہ سچ معلوم ہونے لگے۔

لیکن یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ سچائی کو ختم نہیں کیا جا سکتا، سورج بادلوں کی اوٹ میں جا سکتا ہے، لیکن اس سے اس کا وجود ختم نہیں ہوتا، مدارس اسلامیہ دینیہ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، دراصل پورے ملک میں آج جس قسم کی تعلیمی پالیسی قائم ہے اور جس کے عواقب ونتائج، الحاد ودہریت، لادینی،

خدا بیزاری، مادہ پرستی، اور تہذیبی جارحیت کی شکل میں پورے ملک کو اپنے لپیٹ میں لے رہے ہیں اور جس طرح ملک کے تعلیمی نظام کو بھگوا رنگ میں رنگا جا رہا ہے، اس موج بلاخیز کے سامنے دینی مدارس ہی سینہ سپر ہو سکتے ہیں اور اپنے تعلیمی وتربیتی ماحول ونظام سے انہیں چیلنج کر سکتے ہیں۔ اسلام دشمن طاقتیں اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتی ہیں، اسی لیے انہوں نے مدارس اسلامیہ کے کردار کو مشکوک کرنے کی بھرپور مہم چلا رکھی ہے۔

مولانا محمد عتیق الرحمٰن قاسمی اسسٹنٹ ڈائرکٹر خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کو اللہ جزاء خیر دے کہ انہوں نے اس پوری صورت حال کا بھرپور اور مدلل جائزہ لیا، اور دینی مدارس کی تعلیم وتربیت، مقاصد اور طریقۂ کار کے ساتھ دہشت گردی کی تعریف، اس کے اقسام اور اس کے عواقب ونتائج کا ذکر کر کے ثابت کیا کہ دینی مدارس جس انداز کی تعلیم وتربیت میں لگے ہوئے ہیں، اس میں دہشت گردی کے جراثیم پل ہی نہیں سکتے، بلکہ یہ دینی مدارس جس اعلیٰ اخلاق وکردار اور اقدار کی دعوت دیتے ہیں، اس سے دہشت گردی کا سدباب ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مدارس اسلامیہ کی اہمیت وافادیت دوچند ہو جاتی ہے۔

موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ہم اسے مکتبہ امارت شرعیہ سے مولانا عتیق الرحمٰن قاسمی خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ اللہ کرے یہ کتاب اس گرد وغبار کو دور کرنے میں معاون ہو، جن کا سامنا آج دینی مدارس کو کرنا پڑ رہا ہے۔

(یکم ذی الحجہ ۱۴۲۴ھ)

خطبات سلف

اللہ رب العزت نے بنی نوع انسانی کی ہدایت کے لیے جو طریقہ اختیار کیا، اس میں کتاب اللہ کے ساتھ رجال اللہ کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ عہد نبوی ﷺ، صحابہ اور تبع تابعین کے بعد اہل اللہ علماء، صلحاء اور صوفیاء رجال اللہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے اور تاریخ کے مختلف ادوار میں نہوں نے دین کی بقا اور اسلامی اعمال واقدار کی ترویج واشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔

مولانا محمد شاہد الناصری الحنفی ایسے ہی خانوادہ کے چشم وچراغ ہیں، جس نے مختلف موقعوں پر امت کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا ہے اور ملک کے نامور مذہبی شخصیات، اکابر علماء اور اللہ والوں سے تسلسل کے ساتھ اس خاندان کے تعلقات رہے ہیں۔ مولانا محمد شاہد الناصری الحنفی حفظہ اللہ نے خاندان کی اس روایت کو باقی رکھا اور وقت کے نامور علماء، صلحاء اور اہل اللہ حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڑھی، حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادی، حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی، حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب مظاہری، حضرت مولانا قاری صدیق احمد صاحب باندوی کی صحبت اور مجلسوں کی حاضر باشی کے ذریعہ کسب فیض کیا۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم سے مختلف موضوعات پر مراسلت ومکاتبت کا سلسلہ بھی جاری رہا، اس طرح مولانا محمد شاہد الناصری الحنفی کے جسد خاکی میں بزرگوں کی محبت وعقیدت کوٹ کوٹ کر بھر گئی ہے۔ اس محبت وعقیدت نے ان کو صلحا کے صفات سے مزین کیا، چنانچہ حق گوئی، بے باکی اور جرأت وجواں مردی کو ان کی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ دین پر ثابت قدمی اور فکر آخرت ان کی زندگی کا لازمہ ہے۔

وہ عروس البلاد ممبئی میں زمانہ سے مقیم ہیں اور یہاں کی ملی سرگرمیوں کی روح اور جان ہیں، انہوں نے اپنی پرکشش شخصیت سے احباب ومتعلقین ومعتقدین اور متوسلین کی ایک ایسی جماعت تیار

کر دی ہے، جو ان کے گرد ہر موقع پر ہالہ کی طرح احاطہ کیے رہتی ہے۔ ممبئی کی چکاچوند، بھاگ دوڑ اور معاشی استحکام کی فکر سے بہت لوگ مرعوب رہتے ہیں؛ لیکن مولانا محمد شاہد الناصری الحنفی کے نزدیک اس کی اہمیت کچھ نہیں ہے۔ وہ حج میگزین کے مدیر اور اپنے لکھنے پڑھنے کے کاموں کی وجہ سے بہت حد تک مزاجاً حضرت مولانا قاضی اطہر مبارک پوریؒ سے قریب ہیں اور حضرت مولانا ابوظفر حسان ندوی ازہری صاحب مدظلہ کی سرپرستی میں وہ لکھنے پڑھنے کے کاموں کو آگے بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں۔

خطبات کا یہ مجموعہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اور جس میں رسول اللہ ﷺ، خلفاء راشدین، صحابہ کرام اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے اکابر کے خطبات شامل ہیں، نادر موضوع پر تالیف کی گراں قدر کوشش ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان ملفوظات اور خطبات میں بے پناہ اثر ہے، جو از دل ریزد بر دل خیزد کے صحیح مصداق ہیں اور جن پر عمل کر کے ایمانی، اخلاقی اور اسلامی انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔

خطبات کا یہ مجموعہ ہمیں ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بے نیاز کرتا ہے اور چند صفحات میں ہمارے تزکیہ نفس کا وافر سامان فراہم کرتا ہے، اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس مجموعہ کو قبول فرمائے اور اسے مسلمانوں کے اصلاح حال کا ذریعہ بنائے۔ آمین یارب العالمین وصلی اللہ علی النبی الکریم وعلی آلہ وصحبہ وسلم

فتنوں سے بچیے

ماسٹر نور الحق صاحب سے میری واقفیت کی مدت تیس سالوں سے زائد پر محیط ہے، میں نے ان میں صالحیت اور صلاحیت دونوں محسوس کیا ہے، مذہب سے لگاؤ کی وجہ سے ان کے اندر علماء کی قدر دانی اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ کا شوق شروع سے رہا ہے اور اس مطالعہ نے ان کی زندگی کو ایک رخ دیا اور عملی زندگی گزارنے پر ان کے ایمان ویقین کو پختہ سے پختہ تر کر دیا ہے۔

ایک بڑی خوبی ان کے اندر یہ رہی ہے کہ مطالعہ کے دوران جو چیزیں پسند آئیں ان کو حاصل مطالعہ کے طور پر لکھتے رہے، پھر ان کو موضوعاتی اعتبار سے جمع کرنے کا خیال ہوا تو انہوں نے ایسی تحریروں کو جو فتنوں سے متعلق تھیں یکجا کر دیا اس طرح تاریخی پس منظر میں اچھی خاصی چیزیں جمع ہو گئیں، یہ چیزیں جہاں سے لی گئی ہیں، اس کا حوالہ بھی جا بجا انہوں نے دیا ہے۔

میں نے اس کتاب کا مطالعہ جستہ جستہ کیا ہے، امارت شرعیہ نے ہم لوگوں کا مزاج اس طرح بنا دیا ہے کہ اختلافی موضوعات کو زیر بحث نہ لایا جائے اور اگر بحث ضروری ہو تو مثبت اپروچ پیش کیا جائے، بدعت سے نفرت پیدا کرنی ہو تو سنت کی اہمیت اجاگر کی جائے، اختلاف کی شناعت بتانی ہو تو اتحاد کے فوائد زیر بحث لائے جائیں، اس لیے اس قسم کے اختلافی مضامین پڑھنے پر طبیعت مائل نہیں ہوتی، لیکن ماسٹر صاحب کی خواہش کے احترام میں کچھ نہ کچھ پڑھ لیا اور احساس ہوا کہ بعض اچھے مضامین اس کتاب میں آ گئے ہیں، بعض اختلافی موضوعات بھی ہیں، جن پر بحث کی اچھی خاصی گنجائش موجود ہے، ماسٹر صاحب نے جواز وعدم جواز کی بحثیں جو لکھی ہیں، وہ بھی کہیں سے منقول ہی ہیں، کیونکہ ماسٹر صاحب اپنے مقام ومنصب کو خوب سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ جواز وعدم جواز پر بحث ان کے مقام ومنصب سے اوپر کی چیز ہے، اس لیے اسے بھی حاصل مطالعہ کے طور پر دیکھنا چاہیے۔

فتنوں کے انسداد کے لیے فتنوں سے واقفیت ضروری ہے، ماسٹر نور الحق صاحب نے اس

کتاب میں چند فتنوں سے واقفیت بہم پہنچائی ہے، فتنے اور بھی ہیں جس کی طرف ماسٹر صاحب کی نگاہ نہیں گئی ہے، اس دور کا سب سے بڑا فتنہ مختلف عنوانات سے مسلمانوں کے اتحاد واتفاق کو پارہ پارہ کرنا ہے، فروعی مسائل کو اصولی بنا کر اور انہیں اسٹیج کی زینت بنا کر مسلمانوں کو لڑانا بعض حضرات کا محبوب مشغلہ بن گیا ہے، باطنیت اور قرامطہ وغیرہ جیسے فتنے تو تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں؛ لیکن یہ فتنہ اس قدر ہمارے رگ وپے میں سرایت کر گیا ہے کہ مسلمانوں کی ساری قوت وتوانائی اس کی نظر ہو کر رہ گئی ہے، ماسٹر صاحب اگر اس صورت حال سے متعلق بھی کچھ اقتباسات جمع کرتے تو یہ کتاب زیادہ جامع ہوتی اور آج کے پس منظر میں زیادہ مفید بھی، اللہ کرے یہ کتاب فتنوں کے اس دور میں مسلمانوں کو صراط مستقیم پر گامزن کر سکے، اگر ایسا ہوا تو سمجھئے کہ مؤلف کی محنت ٹھکانے لگی۔

(یکم محرم الحرام ۱۴۳۶ھ)

ملفوظات سجاد

صراط مستقیم پر گامزن کرنے، راہ راست پر لانے، نیکیوں کی طرف راغب کرنے، برائیوں سے نفرت دلانے میں ملفوظات کا بڑا عمل دخل رہا ہے، باتیں زبان سے نکلتی ہیں، لیکن ان کا منبع دل ہوتا ہے، الفاظ کے وسیلے سے یہ باتیں دل سے نکلتی ہیں اور دل تک پہنچ جاتی ہیں، اسی لیے ہمارے یہاں ''از دل خیزد بر دل ریزد'' مشہور ہے۔

حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والتسلیم کے پاس آسمانی کتب وصحائف کے ساتھ اللہ رب العزت نے مؤثر زبان عطا فرمائی تھی، آقا ﷺ کی مجلسوں سے کفار کے دور بھاگنے اور لوگوں کو روکنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی، جو ان کا کلام سن لیتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

آقا ﷺ کی گفتگو کی خصوصیت کے لیے بڑا جامع لفظ جوامع الکلم ہے، مختصر بامعنی، بلکہ ذو معنی اور مؤثر گفتگو آپ کا طرۂ امتیاز تھا، آپ ﷺ کی یہ گفتگو کبھی دعوت دین کے لیے، کبھی معاملات کے حل اور تصفیہ کے لیے اور کبھی خانگی اور گھریلو مجلسوں میں ہوا کرتی تھی، محدثین عظام نے احادیث کا ذخیرہ جو جمع کیا ہے اور جو قرآن کریم کے ساتھ ہماری مذہبی زندگی کا بڑا مستدل ہے، اس کا ایک بڑا حصہ ملفوظات ہی پر مشتمل ہے۔

بعد کے دنوں میں تاریخی تسلسل کے ساتھ صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین، اولیاء کرام اور علماء عظام نے اس سے اصلاح کا بڑا کام لیا، ہر دور میں مجلسیں سجتی رہیں اور اوقات کی تعیین کے ساتھ لوگ اس کے سننے اور استفادے کی غرض سے حاضر ہوتے رہے ہیں۔

ہم نے جن بزرگوں کا دور دیکھا ہے، اس میں الحمد للہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ اور حضرت مولانا مفتی محمود الحسن صاحب کی مجلسوں کا حاضر باش رہا ہوں، حضرت قاری محمد طیب صاحب کی مجلسیں عموما عصر بعد لگتی تھیں جب کہ حضرت مفتی صاحب کی یہ مجلسیں صبح وشام لگا کرتی

تھی، البتہ صبح کی مجلسوں میں عمومی باریابی کم ہوا کرتی تھی، چونکہ طلبہ کے درس کا وقت ہوا کرتا تھا اور ان کے لیے اس وقت حاضری دشوار تھی۔

اس زمانہ میں احقر کا معمول پابندی سے روزنامچہ لکھنے کا تھا، اور ان مجلسوں کے ملفوظات احقر کے پاس محفوظ ہیں، حضرت مفتی محمود الحسن صاحب کے ملفوظات، ملفوظات فقیہ الامت کے نام سے چھپ گئی ہے اور مشہور ومتعارف ہے۔

لغوی طور پر دیکھیں تو ملفوظات اور تقریر میں بڑا فرق نہیں ہے، لیکن اصطلاحی طور پر دونوں الگ الگ چیزیں ہیں، ملفوظات کا اطلاق عموما مجلسی گفتگو پر ہوتا ہے جب کہ تقریر کا دائرہ اس سے بہت بڑا ہے، اور اس کے ساتھ منبر ومحراب، اسٹیج، چوراہے اور نکڑ کا تصور ابھرتا ہے، تقریر میں عموما ایک موضوع پر ہوتی ہیں، اور کئی موضوع کو ٹچ کرنے والے واعظ کہلاتے ہیں اور اس میں مذہبی عنصر غالب ہوتا ہے اور اس طرح ایک بڑے حلقے تک پہنچ جاتی ہے۔

قدیم ملفوظات میں مجلسی گفتگو کو ہی جمع کیا جاتا تھا اور تقریر کو اس سے الگ رکھا جاتا تھا، خطابت کی اپنی ایک الگ صنف تھی، لیکن ان دنوں ملفوظات کے نام سے جو کتابیں لکھی جارہی ہیں، ان میں یہ التزام نہیں ہے، بلکہ تقریر، خطبات تحریری تک اس کے دائرہ کو وسعت دیدی گئی ہے، اس سے دائرہ کے ساتھ افادیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

مفتی نیر اسلام استاذ دار العلوم الاسلامیہ امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ جو کئی اہم کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں، اور جن کا ذہن اس قسم کے کاموں میں خوب چلتا ہے، انہوں نے ملفوظات اکابر امارت شرعیہ کے نام سے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے، جو انشاء اللہ کئی ضخیم جلدوں میں آئے گا، ملفوظات کی پہلی جلد بانی امارت شرعیہ ابو المحاسن مولانا محمد سجادؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے، احقر نے بھی مولانا سجاد سمینار کے موقع سے حضرت کے ملفوظات کو پہلی بار یک جا کیا تھا، جو مولانا سجاد- حیات وخدمات'' کے   تا   تک پھیلا ہوا ہے، کتاب کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ احقر کی یہ تحریر مفتی صاحب کے پیش نظر رہی ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان ملفوظات سے امارت شرعیہ کی فکر، تحریک اور خود بانی امارت شرعیہ کی

سیرت ان کی فکرمندی، ملت کی شیرازہ بندی، ان کی ذہن رسا، قرآن واحادیث کے فہم میں ان کی گہرائی اور گیرائی، ان کی حاضر جوابی اور مسائل کے حل کے لیے ان کی جد وجہد کے کئی پوشیدہ ابواب سامنے آئیں گے۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو ان کی دوسری کتابوں کی طرح قبول فرمائے اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

(۲۹/۲/۱۴۳۶ھ-۲۳/۱۲/۲۰۱۴ء)

مدارس اسلامیہ کے ذرائع آمدنی اوران کے شرعی احکام

مفتی مظفر اقبال قاسمی کا شمار نئی نسل کے ممتاز علماء میں ہوتا ہے۔ وہ مغربی بنگال کے قدیم ادارہ مدرسہ اشرف المدارس کلٹی بردوان کے صدر مدرس ہیں، لکھنے پڑھنے کا ذوق اچھا ہے، گو درسی اور انتظامی مصروفیات کی وجہ سے اس کا موقع کم ہی ملتا ہے۔

موصوف کی تازہ ترین تالیف ''مدارس اسلامیہ کے ذرائع آمدنی اوران کے شرعی احکام'' میرے سامنے ہے، اصلا یہ رسالہ اکابرامت کے فتاوے کا مجموعہ ہے، جو مختلف سوالوں کے جواب میں بڑوں نے تحریر فرمایا ہے۔ آج کے دور میں جب تھوڑی بہت شد بد ہونے کے بعد لوگ جدید تحقیقات کے نام پر اپنی آراء کے انبار لگا دیتے ہیں اور محتاط علماء کی تحقیقات سے چشم پوشی کر کے یا اسے عہد رفتہ کی چیز قرار دے کر پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ مفتی مظفر اقبال قاسمی کا یہ طریقہ مفید بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔

امید ہے مفتی صاحب کا یہ رسال جس میں انہوں نے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہا ہے، مقبول ہوگا، اور عام مسلمان نیز مدارس کے ذمہ داران (جس میں بڑی تعداد اب غیر علماء کی ہونے لگی ہے) اس سے فائدہ اٹھائیں گے، اس طرح اس کا نفع عام اور تام ہوگا۔ فقط

(۲۳/ جمادی الثانی ۱۴۲۶)

ساجد کمال کی سنگ میل

اللہ رب العزت نے انسان کو پیدا کیا اور اسے حساس دل، اعلیٰ ذہن، زرخیز دماغ اور منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مضبوط و توانا اور پرکشش جسم عطا فرمایا ''سیروا فی الأرض وابتغوا من فضل اللہ'' (زمین میں گھومو اور رزق تلاش کرو) کا سلوگن اور موٹو دے کر پوری کائنات کو میدان عمل بنانے کی تلقین کی، سرحد کی لکیروں کو اقلیدس کے موہوم نقطوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی ئی اور ہر ''ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست'' اور بقول علامہ اقبال ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کے وسیع کینواس کو لے کر مسلمان ساری دنیا میں پھیل گئے اور اپنی ساری صلاحیتیں اور توانائیاں اس ملک کی نذر کر دیئے جہاں وہ فکر معاش اور روشن مستقبل کی چاہ میں گئے۔

برصغیر ہندوپاک سے مسلمان بڑی تعداد میں متحدہ عرب امارات آئے اور اس وقت آئے جب یہاں صحراؤں میں خاک اڑتی تھی، نہ بلند و بالا عمارتیں تھیں، نہ یہ کروفر تھا اور نہ دولت کی ریل پیل تھی، پھر سب مل کر اس ملک کی ترقی میں جٹ گئے، یہ اپنے ساتھ صحرا کو گلزار بنانے کا فن لائے تھے، سب نے مل کر فن کاری دکھائی، انجنیر نے نقشے بنائے، معماروں نے دن رات خون و پسینہ ایک کیا، مزدوروں نے دن کا چین اور رات کی نیند قربان کیے، گھر، در، بیوی بچوں کی جدائی اس پر مستزاد۔ پھر زمین کچھ نقوش ابھرنے لگے، دیکھتے دیکھتے یہ نقوش عالیشان عمارتوں میں بدل گئے، صاف ستھری، کشادہ سڑکیں بن گئیں، پارک اور صحن بنے، اور ان کی شان و شوکت کو دوبالا کرنے اور ملک کی اقتصاد کو مضبوط کرنے کے لیے تجار نے اپنے سرمایے لگائے، حکمراں طبقے نے کشادہ دلی دکھائی، سہولیات فراہم کیے، نتیجہ یہ ہوا کہ یہ دنیا کی بڑی تجارتی منڈی بن گئی، دنیا بھر کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہونے لگے اور امارات سیاحوں کی جنت بن گئی، اب لوگ یہاں آتے ہیں اور اپنی خواہشوں، چاہتوں اور ارمانوں کی تکمیل کے بعد واپس ہوتے ہیں، اچھے لوگوں کی اچھی خواہشیں پوری ہوتی ہیں اور برے لوگوں کے لیے

بھی سامان عیش و کشش کم نہیں ہے۔ پوری دنیا میں نیکوکاروں کے جو مراکز ہیں، ان کی آب و تاب، چمک و دمک اور رونق رزم و بزم میں بھی یہاں کی نلکوں سے سپلائی ہونے والے پانی کی اپنی اہمیت ہے۔ پانی کے ان دھاروں کی چمک گزشتہ سالوں میں داخلی و خارجی حالات کی وجہ سے کم ہوئی ہے۔ لیکن اب بھی باقی ہے۔

زیر نظر کتاب ''سنگ میل'' انہی باکمال ہنرمند جیالوں کے تذکروں پر مشتمل ہے، جنہوں نے متحدہ عرب امارات کی تعمیر و تشکیل میں بھرپور حصہ لیا ہے، یہ تذکرہ خاکے سے قریب ہے، البتہ ان میں خاکہ اڑایا نہیں گیا ہے، لکھا گیا ہے۔ زندوں پر لکھنا ایک مشکل کام ہے۔ کس جملے اور کس تعبیر سے کس کی پیشانی پر بل آجائے گا کہنا مشکل ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ امارات میں رہنے والے برصغیر کے ہی دو باکمال ادیب و صحافی ڈاکٹر ساجد کمال اور شعیب عابدین نے ان دشوار گزار راستوں کو عبور کر لیا ہے، میں ان کو اس کامیابی پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں جب کوئی اس موضوع پر قلم اٹھائے گا تو اس کتاب کی حیثیت ماخذ اصلی کی ہوگی اور وہ اس راستے کی آبلہ پائی سے بچ جائے گا۔

اس موقع پر میں ان لوگوں کو بھی خراج عقیدت پیش کرتا ہوں جو میناروں کے کلش نہ بن سکے، ''سنگ میل'' کے دکھائی دینے والے حصے بھی ان کا مقدر نہ بن سکے، ان کی ساری توانائیاں زیر زمیں چلی گئیں، وہ بنیاد کی اینٹ بن گئے، بنیاد کی اینٹ پر نظر کسی کی نہیں جاتی، لیکن سب مانتے ہیں کہ ان گنبدوں کی ساری رونق انہیں کے دم سے ہے، ان کے نام، کام تاریخ کے صفحات میں نہیں ملتے؛ لیکن تاریخ کی پرشکوہ عمارت اسی پر کھڑی ہوتی ہے، نیک خواہشات کے ساتھ جوان دونوں حضرات کے حصے میں آئی ہیں۔

زکوۃ کے شرعی مسائل

قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے نماز کے قیام کے ساتھ ادائیگی زکوۃ کا بار بار ذکر کیا ہے۔ جس سے اس رکن کی خصوصی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے نماز کے ساتھ زکوۃ سے بھی بے اعتنائی برت رکھی ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ اس معاملہ میں سستی کچھ زیادہ ہی ہے۔

اس سستی کا تقاضہ یہ ہے کہ زکوۃ کی اہمیت اور اس کے مسائل کو عام کیا جائے اور جس طرح تبلیغی جماعت کے چھ اصولوں میں اقامت صلوۃ پر زور دیا جاتا ہے اسی نہج پر تحریک زکوۃ بھی چلائی جائے اور گاؤں گاؤں میں اس سلسلہ میں گفتگو کی جائے اور بتایا جائے کہ شہر ہی نہیں دیہات کے بھی بیشتر لوگوں پر زکوۃ فرض ہے، عشر کی ادائیگی ضروری ہے حالانکہ کم لوگ اس بات کو جانتے ہیں۔

ہمارے اس دور میں اس کام کی فکر مخدوم محترم حضرت مولانا عبدالمنان صاحب مدظلہ العالی ناظم مدرسہ امدادیہ اشرفیہ راجوپٹی سیتامڑھی کو اللہ تعالی نے خصوصیت کے ساتھ ودیعت کی ہے، وہ اسے تحریک کی شکل دینے کے لیے کوشاں ہیں، اس سلسلہ میں انہوں نے پانچ سو مدارس اسلامیہ کو خطوط بھی لکھے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری بے حسی ایسی ہے کہ ہم نے ان خطوط کے جواب دینے بھی گوارہ نہیں کیے۔

میرے عزیز دوست مولانا تنویر احمد خان قاسمی کا یہ رسالہ زکوۃ کے موضوع پر ہے۔ مولانا تنویر احمد خان قاسمی نے مدرسہ امدادیہ اشرفیہ راجوپٹی سیتامڑھی میں تعلیم حاصل کی ہے۔ کیا بعید کہ مولانا عبد المنان صاحب کی فکر نے ان کو اس موضوع کی طرف متوجہ کیا ہو اور وہ اپنی پہلی تالیف میں اس موضوع کو اٹھا بیٹھے ہوں۔

اس رسالہ کو میں نے از اول تا آخر پڑھا ہے، رسالہ کے مندرجات پر مجھے صحت کا یقین ہے۔ اسلوب میں سادگی، روانی، برجستگی اور ایجاز ہے۔ اللہ کرے کہ عام مسلمانوں کے لیے اس کا نفع عام و تام ہو اور مسلمان اس اہم رکن کی ادائیگی میں پورے اسلامی اصولوں کے مطابق حصہ لینے لگیں۔

(۱۹/ رجب ۱۴۲۴ھ)